51 Zaariyaath Makky Aayaath 60

بســم الله الرحمن الرحيــم

سوره الذريت

یہ سورۃ مکی ہے۔ اس میں ساٹھ ۶۰ آیتیں تین سو ستر ۳۷۰ کلمے اور ایک ہزار دو سو چھیاسی ۱۲۸۶ حروف ہیں (تفسیر نیشاپوری)

اس سورہ کی ابتداء بھی قسم سے ہوی ہے۔ اور علم اقسام القرآن بھی علوم قرآن کے منجملہ ایک خاص علم ہے جس کو مفتاح السعادۃ اور کشف الظنون میں علم تفسیر کے فروع میں شمار کیا گیا ہے۔

امام رازیؒ نے سورۃ الصافات کی ابتداء میں کسی قدر تفصیل سے اور اس سورہ کی ابتداء میں اجمالاً اس علم کے مباحث لکھے ہیں۔ فقیر کے علم ناقص کی حد تک علامہ ابن قیم نے خاص اس علم پر ایک مستقل کتاب مسمّیٰ "التبیان" لکھی ہے جو مطبوع اور متداول ہے۔ امام جلال الدینؒ سیوطی نے بھی اپنی مشہور اور ہر دلعزیز کتاب "الاتقان فی علوم القرآن" میں اس عنوان کو ایک خاص نوع قرار دی ہے جس کا خلاصہ یہہ ہے۔

اقسام القرآن کے متعلق چار امور غور طلب ہیں۔

(۱) قسم کس کے مقابلہ میں کھائی جاتی ہے۔

(۲) وجوہ قسم یعنے قسم کیوں کھائی جاتی ہے۔

(۳) مقسم بہ یعنے کن امور کی قسم کھائی جاتی ہے۔

(۴) مقسم علیہ یعنے کن امور پر قسم کھائی جاتی ہے۔

نمبر (۱) کے متعلق گزشتہ سورۃ "قٓ" کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے کہ منکرین کے مقابلہ میں قسم کھائی جاتی ہے کیونکہ اپنے مطلب کو حلف اور یمین سے ثابت کرنا عرب کا عام رواج ہے۔ لہذا باقی تین عنوان کا ملخص یہ ہے

وجوہ قسم

(۱) تاکید کلام کیلئے۔

(۲) اتمام حجت کیلئے۔

(۳) کسی کی فضیلت ظاہر کرنیکے لئے۔

(۴) یا کسی منفعت بتانیکے لئے۔

(۵) مخاطب کو خاص طور پر توجہ دلانیکے لئے چنانچہ امام[1] رازی تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں کہ متکلم جب اپنے کلام کی ابتداء قسم سے کرتا ہے تو

[1] تفسیر کبیر جلد ہفتم صفحہ (۲۲۲)

سامع خیال کرتا ہے کہ متکلم کوئی بڑی بات بیان کر رہا ہے۔ پس اس بات کو زیادہ توجہ سے سنتا ہے بہ نسبت غیر موکد کلام کے۔

(۶) جہاں شہادت موجود ہوتی ہے وہاں قسم کی ضرورت نہیں۔ جہاں شہادت موجود نہ ہو وہاں قسم کھائی جاتی ہے۔

(۷) الایمان اللتی حلف اللہ تعالیٰ بہا کلّہا دلائل اخرجہا فی صورۃ الایمان یعنے اللہ تبارک وتعالیٰ نے جن چیزوں کی قسم کھائی ہے وہ سب اُس کی قدرت کے دلائل ہیں جن کو قسم کی صورت میں بیان فرمایا ہے۔

مقسم بہ

اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں سات مقامات پر اپنی قسم کھائی ہے باقی اور مقامات میں اپنے مخلوقات کی قسم کھائی ہے۔ اور مصنوع کی قسم دراصل صانع کی قسم ہے کیونکہ مصنوع اپنے صانع پر اور مخلوق اپنے خالق پر دلالت کرتا ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ جہاں مصنوع کی قسم کھائی گئی ہو وہاں مضاف محذوف ہے یعنے والشمس سے مراد آفتاب کی قسم نہیں بلکہ رب الشمس یعنے آفتاب کو پیدا کرنے والے خدا کی قسم ہے۔

بعض علماء کا قول ہے کہ خدا نے تین چیزوں کی قسم کھائی ہے۔ اپنے ذات کی۔ اپنے افعال کی۔ اپنے مخلوق کی۔

خیال رہے کہ غیر خدا کی قسم ہمارے لئے شرعاً ناجائز ہے۔ چنانچہ ابن ابی حاتم حضرت حسنؓ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ اپنی جس مخلوق کی چاہے قسم کھا سکتا ہے لیکن کسی اور کو غیر خدا کی قسم کھانا نادرست ہے۔

قرآن کے مقسم علیہ

قرآن کے مقسم علیہ

(۱) اصول ایمان پر جن کی معرفت مخلوق پر واجب ہے قسم کھائی گئی ہے
(۲) توحید پر قسم کھائی گئی ہے۔
(۳) قرآن حق ہونے پر قسم کھائی گئی ہے۔
(۴) رسول کے 〃 〃 〃 〃 〃
(۵) جزا۔ وعدہ و وعید حق ہونے پر قسم کھائی گئی ہے۔
(۶) انسان کی حالت پر قسم کھائی گئی ہے۔

سورۃ ق و ذاریات کا باہمی ربط و مناسبت

اس سورۃ کی ابتداء اپنی پہلی سورہ "ق" کے آخر سے مناسبت رکھتی ہے

کیونکہ جب اللہ تبارک و تعالیٰ نے حشر کے دلائل بیان کر دیئے اور پھر فرمایا کہ حشر ہمارے لئے آسان ہے۔ اپنے حبیب پاکؐ سے یہ بھی فرما دیا کہ تمہارا کام ایمان کے لئے ان کو مجبور کرنا نہیں بلکہ صرف ہمارا پیام اُن تک پہنچا دینا ہے پھر اُن کے سامنے برہان قائم ہونے اور قرآن پڑھے جانے کے باوجود بھی وہ اپنے کفر پر اصرار کرتے رہے تو اب سوائے قسم کے اتمام حجت کے لئے کوئی اور صورت باقی نہیں رہی تھی اس لئے اس سورۃ کی ابتدا بھی قسم ہی سے ہوئی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

51-1 وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا ۙ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۙ فَالْجٰرِیٰتِ یُسْرًا ۙ 51-
51-2 51-4 فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۙ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۙ وَّاِنَّ الدِّیْنَ 51-
51-5 لَوَاقِعٌ ؕ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ۙ اِنَّكُمْ لَفِیْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۙ 51- 51-
51-9 یُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ؕ قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ۙ الَّذِیْنَ هُمْ 51-1
51-1 فِیْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ ۙ یَسْــَٔلُوْنَ اَیَّانَ یَوْمُ الدِّیْنِ ؕ یَوْمَ هُمْ 51-1
51-1 عَلَى النَّارِ یُفْتَنُوْنَ ۙ ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ ؕ هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ 51-1
بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۙ

قسم ہے (خاک واجزائے خاک کو) اڑا لے جانے والی ہواؤں کی۔ پھر
بوجھ اٹھانے والی (گھٹاؤں) کی۔ پھر نرمی سے چلنے والی (کشتیوں)
کی۔ پھر حکم کے بموجب تقسیم کرنے والے (فرشتوں) کی۔ بے شک جو وعدہ
تم سے کیا جاتا ہے وہ سچا ہے اور یقیناً اعمال کا بدلہ ملنے والا ہے۔ قسم
ہے راستوں والے آسمان کی بے شک تم مختلف اقوال میں (پھنسے ہوئے)
ہو۔ وہی شخص (بھلائی کی طرف) پھیرا جاتا ہے جو (اس اختلاف سے)
باز رہے۔ اٹکل دوڑانے والے مارے گئے یہ لوگ وہ ہیں جو
غفلت میں پڑے ہوئے (اور بھٹک رہے) ہیں۔ پوچھتے ہیں کہ جزاء
کا دن کب آئے گا (یعنی قیامت کب ہوگی) اس دن وہ لوگ آگ
میں جھونکے جائیں گے (اور ان سے کہا جائے گا) کہ اپنی فتنہ انگیزی
کا مزہ چکھو۔ یہ (چیز) وہی ہے جس کے لئے تم جلدی کر رہے تھے۔

اس سورۃ کی ابتدا میں جو چار امور بیان فرمائے گئے ہیں اگر ان
امور کو ہواؤں کی صفتیں قرار دیں تو اس سے مراد ان امور کی ترتیب
وجودی ہوگی یعنی اس صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ قسم ہے ہواؤں کی

جن میں یہہ چار صفتیں یکے بعد دیگرے پائی جاتی ہیں۔ اور اگر ان چاروں کو جدا جدا چار امور کہیں تو اس صورت میں "فاء" قسم میں ترتیب کے لئے ہوگا نہ کہ مقسم بہ کی ترتیب کے لئے۔ گویا اللہ تبارک تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں قسم کھاتا ہوں اڑا لے جانے والی ہواؤں کی۔ پھر قسم کھاتا ہوں بوجھ اٹھانے والے ابر کی۔ پھر قسم کھاتا ہوں آسانی سے چلنے والی کشتیوں کی۔ پھر قسم کھاتا ہوں تقسیم کرنے والے فرشتوں کی۔ یہی مطلب درست ہے کیونکہ اس کی تائید دو روایتوں سے ہوتی ہے۔

حاکم نے مستدرک میں ابو الطفیل سے یہہ روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے امیر المومنین حضرت سیدنا علی ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا کہ منبر پر کھڑے ہوئے ارشاد فرما رہے تھے۔ "مجھ سے پوچھو اس سے پہلے کہ پھر پوچھ نہ سکو اور میرے بعد میرے ایسے شخص سے نہ پوچھو گے" (یعنی اس وقت کو غنیمت سمجھو اور جو پوچھنا ہے پوچھ لو ورنہ میرے بعد مجھ سا جواب دینے والا نہ ملے گا) لہذا ابن کوا کھڑے ہوئے اور کہا کہ اے امیر المومنین! "ما الذّٰریٰت ذروا" یعنی ذاریات ذروًا کیا چیز ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ ہوائیں ہیں۔ پھر انہوں نے کہا کہ "الحاملات وقرًا"

کیا چیز ہیں آپ نے جواب دیا کہ سحاب یعنی ابر ہے۔ انہوں نے پوچھا
کہ "الجاریات یسرا" کیا چیز ہیں؟ آپ نے جواب میں فرمایا کہ کشتیاں
ہیں۔ انہوں نے کہا کہ "مقسمات امرا" کیا ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ
وہ فرشتے ہیں۔ پھر ابن کوا نے پوچھا کہ "اَلَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ
کُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَھُمْ دَارَ الْبَوَارِ جَھَنَّمَ" یعنی خدا کی نعمت کو ناشکری
سے بدلنے والے اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر دوزخ میں جھونکنے والے
کون لوگ ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ اس سے قریش کے منافقین مراد
ہیں۔ اس حدیث کو حاکم نے مستدرک میں صحیح الاسناد بیان کیا ہے
اور امام ذھبی نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔[1]

اس کی تائید میں دوسری روایت حافظ ابن کثیر[2] نے اپنی تفسیر
میں سعید بن المسیب سے یہ نقل کی ہے کہ صبیغ تمیمی حضرت عمر بن الخطاب
رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ سے پوچھا کہ اے امیر المومنین
مجھے "الذریت ذروا" کے متعلق خبر دیجے تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ
وہ ہوائیں ہیں اور اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بیان

---

[1] ۔ مستدرک جلد دوم صفحہ (۴۶۷)
[2] ۔ تفسیر ابن کثیر جلد نہم برحاشیہ تفسیر فتح البیان صفحہ (۳۰۷) مطبوعہ مصری۔

فرماتے ہوئے نہ سنتا تو میں یہ نہ کہتا۔ اس نے کہا کہ "المقسمات امراً" کیا چیز ہیں؟ تو آپ نے جواب دیا اس سے فرشتے مراد ہیں۔ اور اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بیان فرماتے ہوئے نہ سنتا تو میں یہ نہ کہتا۔ پھر اس نے پوچھا کہ "الجاریات یسراً" کیا ہیں مجھے بتائیے تو آپ نے فرمایا کہ اس سے مراد کشتیاں ہیں۔ اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے نہ سنتا تو میں یہ نہ کہتا۔ پھر اس کے بعد آپ (یعنی حضرت عمرؓ) نے اس (صبیغ یتیمی) کو سَو درے مارنے کا حکم دیا اس کے بعد آپ نے اس کو ایک گھر میں نظر بند کر دیا جب وہ چنگا ہو گیا تو اس کو بلوا کر اور سَو درے لگوائے۔ پھر آپ نے اس کو سواروں کے ساتھ ایک کجاوے میں لاد کر حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے پاس بھجوا دیا اور یہ حکم دیا کہ لوگوں کو اس شخص کے پاس بیٹھنے سے منع کر دو۔ ایک عرصہ تک اس پر عمل رہا۔ یہاں تک کہ (صبیغ تمیمی) حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اپنے ایمان کا یقین دلایا اور سخت قسم کھائی کہ پہلے میں اپنے جی میں جو بات پاتا تھا وہ اب نہیں پاتا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے حضرت عمرؓ کو لکھ بھیجا تو حضرت عمرؓ نے جواب

جواب دیا کہ میرا خیال ہے کہ اس نے سچ کہا۔ لہذا لوگوں کو اس سے ملنے جلنے کی اجازت دے دو۔ حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہہ حدیث ضعیف ہے مگر صبیغ کا یہ واقعہ مشہور ہے جس کو حافظ ابن عساکر نے صبیغ کے ترجمہ (یعنی تذکرہ) میں تفصیل سے بیان کیا ہے صبیغ کو سزا دینے کی یہہ وجہہ تھی کہ اس نے شرارت اور عناد سے یہہ سوالات کئے تھے تفقہ یعنی سمجھنے کے لئے نہیں کئے تھے۔

اُن دونوں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی ہوا کے چار وصف مراد نہیں ہیں بلکہ چار علٰحدہ علٰحدہ چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے۔ لہذا وجود میں ترتیب نہیں یعنی یہ مراد نہیں ہے کہ اُن ہواؤں کی قسم جو غبار اڑاتی ہیں اور پھر بوجھ اٹھاتی ہیں۔ اور پھر نرم نرم چلتی ہیں اور پھر تقسیم کرتی ہیں۔ بلکہ مُقسَمٌ بہ میں ترتیب ہے یعنی غبار اڑانے والی ہواؤں کی قسم اور پھر بوجھ اُٹھانے والے بادلوں کی قسم اور آسانی سے چلنے والی کشتیوں کی قسم۔ پھر فرشتوں کی قسم جو حکم کے بموجب تقسیم کرنے والے ہیں۔

ان دونوں روایتوں کی موجودگی میں ان کے سوا کسی اور معنی کو

ترجیح نہیں دی جا سکتی کیوں کہ حضرت قبلہ قدس سرہ کی اتباع وتقلید میں فقیر کا بھی مطمح نظر یہی ہے کہ تفسیر قرآن میں صرف مستند آثار و احادیث پیش کئے جائیں تاکہ عربی سے ناواقف بھائیوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ سلف صالحین ان آیات کے کیا معنی سمجھتے تھے۔ اور فقیر کے نزدیک ضرورت وقت بھی اسی کی متقاضی ہے تاکہ جدید علوم کی روشنی میں قرآن حکیم کو سمجھنے کی کوشش کرنے والے ان مقدس ذہنیتوں کو بھی پیش نظر رکھیں کہ قرآن حکیم کے اولین مخاطب جن کی تعریف خود اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے کلامِ پاک میں فرماتا ہے، انہوں نے ان آیات کا مطلب کیا سمجھا تھا۔ اور برقی روشنی میں قرآن پڑھنے والوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ جو لوگ مشکوٰۃ نبوت کے انوار میں قرآن پڑھتے تھے وہ اس کے کیا معنی سمجھے تھے۔ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

انسان خود غرض اور کوتاہ اندیش ہے۔ خود غرضی سے چاہتا ہے کہ اپنی خداداد صلاحیتوں سے کام لے کر نعماتِ قدرت سے جس قدر لذت حاصل کر سکتا ہے حاصل کر لے۔ مگر کوتاہ اندیشی سے اپنے پر کوئی ذمہ داری نہیں لینا چاہتا۔ اس کو اچھے بُرے کی تمیز نہیں۔ حق و باطل کی پرکھ نہیں

حُسن وقبح کا اُس کے پاس کوئی معیار نہیں۔ کیوں کہ شریعت کی روشنی کے بغیر عقل کا راہوار قدم قدم پر ٹھوکر لیتا ہے۔ اس کی حالت اُس بیمار کی سی ہے جو مضر و مہلک چیزوں کو بھی مزے لے لے کر کھا جانا چاہتا ہے۔ مگر ایک مہربان و شفیق طبیب انتہائے شفقت سے ان کے نتائج سے قبل از قبل اس کو واقف کرا دیتا ہے بس اسی طرح وہ حکیم مطلق اور ارحم الراحمین بھی کمال حکمت ورحمت سے قسم کھا کر اس کو یقین دلاتا ہے کہ قیامت کا جو وعدہ اس سے کیا گیا ہے وہ پورا ہو کر رہیگا اور اُس روز اُس کو اپنے اعمال کی جزاء و سزا ملیگی۔ لہٰذا اے کوتاہ اندیش! عاقبت کی فکر کر اپنی ذمہ داری کو محسوس کر۔ اپنی خداداد صلاحیتوں سے کام لے۔ خدا کی پیدا کی ہوئی نعمتوں سے لطف اندوز ہو مگر یہ سب شریعت کی روشنی میں کرتا کہ ان فانی لذتوں میں پھنس کر ابدی مصیبتوں میں نہ گرفتار ہو جائیے لہٰذا ارشاد ہوتا ہے کہ

5. إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَصَادِقٌ 6. وَإِنَّ الدِّينَ لَوَاقِع

جس کی تفسیر میں مجاہد کہتے ہیں کہ حساب۔ ثواب۔ عذاب ضروری ہے۔ اور اللہ اپنے بندوں کو اعمال کی

جزادے گا۔[1]

اپنی بات یعنی وعدہ قیامت کی قسم سے تاکید فرمادینے کے بعد منکرین کے قول کے متعلق ارشاد ہوتا ہے جس کی تاکید مکرر قسم سے فرمائی گئی ہے۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ

یعنی قسم ہے راستوں والے آسمان کی کہ بے شبہ تم مختلف اقوال میں پھنسے ہوئے ہو۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضؓ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد آسمان کی خوشنمائی۔ رونق۔ اور عمدگی و یکتائیت ہے۔ مجاہد۔ عکرمہ۔ سعید ابن جبیرؒ۔ ابو مالک۔ ابو صالح۔ سدی۔ قتادہ عطیہ۔ اور ربیع بن انس بھی اسی کے قائل ہیں۔

عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ اس سے ساتواں آسمان مراد ہے۔

حباک دراصل ریت کے ٹیلہ کے راستہ کو کہتے ہیں جس کی جمع حُبُک "والسماء ذات الحبك" کے معنی قسم ہے راستوں والے آسمان کی یعنی اس آسمان کی جس پر ستاروں کے گزرنے کے راستے ہیں یہ لفظ مضبوطی۔ قوی اور عمدگی کے معنی میں بھی آتا ہے۔[2]

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری جلد ۲۶ صفحہ (۱۱۷)۔
[2] مصباح اللغات۔

منکرین کی اختلاف بیانی جس کا ذکر اللہ تبارک تعالیٰ فرماتا ہے وہ کسی ایک امر کی حد تک نہیں بلکہ تینوں اصولی امور میں پائی جاتی ہے کیوں کہ امر حق ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے جب ہوائے نفسانی اور اغوائے شیطانی کی وجہ کوئی شخص حق سے روگرداں ہو جائے تو لامحالہ اس کے اعتقادات اس کے اقوال اور اس کے خیالات میں بھی اختلاف ہوگا۔

اسی قانون قدرت کے بموجب منکرین قریش بھی کسی ایک بات پر قائم نہ رہ سکے اور جو ایک بات پر قائم نہیں رہتا وہ کسی عقیدہ میں بھی پکا نہیں ہوتا جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنے اعتقاد میں کچے ہیں اور جو اپنا یہ یقین ظاہر کرتے ہیں وہ محض نمائشی اور شدت عناد کے سبب ہے لہٰذا توحید[1]۔ رسالت[2] اور قیامت[3] تینوں کے متعلق ان کے بیان میں اختلاف و تناقض موجود ہے۔

توحید کے متعلق ان کی اختلاف بیانی یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ یہ کہتے ہیں کہ زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا اللہ ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں۔ پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ خدا معبودوں کا معبود یعنی الٰہ الآلہہ ہے۔ جب وہ زمین و آسمان کا خالق خدا ہے تو زمین و آسمان پر جو کچھ ہے

ان سب کا خالق بھی خدا ہی ہوا۔ پھر یہ معبود بھی اسی کے مخلوق ہوئے لہٰذا مخلوق کو خالق کے ساتھ الوہیت میں شریک کر دینا صرف اپنی جہالت و حماقت کا ثبوت دینا ہے۔

۲ رسالت کے متعلق منکرین کی اختلاف بیانی یہ ہے کہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی امین، کبھی جھوٹا (معاذ اللہ) کبھی مجنون (معاذ اللہ) کبھی شاعر، کبھی ساحر کہتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ وہ آپ کے بارے میں بھی کسی ایک بات پر قائم نہیں بلکہ ان کے بیان میں تناقض ہے ایک طرف وہ آپ کو (معاذ اللہ) مجنون کہتے ہیں دوسری طرف یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ ہم پر قوت جدل سے غالب آئے ہیں حالاں کہ کوئی مجنون ایک منظم اور معجز کلام کی کیسے قدرت رکھ سکتا ہے۔

۳ قیامت اور حشر کے متعلق بھی ان کی بات میں اختلاف و تناقض ہے کیوں کہ ایک طرف تو وہ یہ کہتے ہیں کہ حشر نہ ہوگا اور مرنے کے بعد حیات نہیں۔ پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے آباء اجداد کو اسی طریقہ پر پایا۔ جب موت کے بعد کوئی زندگی نہیں اور میت کو کوئی شعور نہیں ہوتا تو پھر ایسی حالت میں وہ اپنے آبا کے خلاف کریں تو ان کے مردوں کو کیا

نقصان پہونچے گا۔ یہہ تو وہی کہہ سکتا ہے جس کو یہ یقین ہو کہ موت کے بعد عذاب ہوگا ہم کوئی ایسی بات نہ کریں جو ان مردہ بزرگوں کو بری معلوم ہو لہذا ان کا یہ کہنا کہ مرنے کے بعد ہم اپنے آباء کو گمراہی کی طرف منسوب نہ کریں گے ان کی پہلی بات کے صریحی متناقض ہے[1]۔

یُؤفَكُ عنہ من افك اس ضمیر کے متعلق اختلاف ہے۔ قاضی بیضاوی رح لکھتے ہیں کہ والضمیر للرسول[1] صلی اللہ علیہ وسلم او القرآن[2] او الایمان[3]۔ او یصرف[4] من اصرف فی علم اللہ وقضائہ ویجوز[5] ان یکون الضمیر للقول۔ اور اسی لحاظ سے اس آیت کی تفسیریں بھی مختلف کی گئی ہیں۔ امام رازی رح نے اس کی چار توجیہیں بیان فرمائی ہیں۔

(۱) یہہ مومنین کی تعریف ہے کہ وہ اس قول مختلف سے (جن میں کفار پھنسے ہوئے ہیں) علیحدہ ہیں اور ہدایت اور درست بات پر قائم ہیں۔

(۲) یہہ کافروں کی مذمت ہے کہ وہ رسولؐ سے الگ اور جدا ہیں۔

---

[1] تفسیر کبیر جلد ہفتم صفحہ (۶۳۰)۔

(۳) قول قیامت کے بارے میں یہ علحدہ ہیں۔

(۴) قران سے الگ ہیں۔

فقیر کے خیال میں پہلی توجیہ زیادہ قرین صواب ہے۔ اس لئے کہ اس صورت میں ضمیر کا مرجع بالکل قریب ہے اور مرجع قریب کو چھوڑ کر بلا وجہ مرجع بعید کو اختیار کرنا ایک حد تک تکلّف ہے۔ لہذا مطلب یہ ہوا کہ منکرین قریش کو خطاب کرکے اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ اپنی بے جا ضد و عناد سے ان اختلافات اور خرافات میں پھنس کر تم اپنی عاقبت برباد کر رہے ہو حالانکہ وہی شخص بھلائی کی طرف پھیرا جاتا ہے جو امر حق کو قبول کرے اور ثابت قدمی سے اس پر زندگی بھر قائم رہے اور جو لوگ حق کو چھوڑ کر محض اٹکل دوڑاتے ہیں ان کا انجام بیان فرماتا ہے کہ

قتل الخراصون اٹکل دوڑانے والے مارے گئے۔ ''خرص'' کے معنی درخت وغیرہ سے ثمرہ کا اندازہ کرنا کہ کتنا ہوگا جس کو حیدرآباد میں انجنا کہتے ہیں۔ چنانچہ محیط المحیط میں لکھا ہے کہ الخرص اسم من خرص تقول کم خرص ارضك ای کم قدرھا یہ اندازہ چونکہ غیر یقینی ہوتا ہے اس لئے خراص جھوٹے کے معنی میں بھی

آتا ہے۔ الخرّٰصون ای الکذابون یعنی خراص معنی جھوٹا[1] بعض مفسرین کہتے ہیں کہ خراصون سے مراد الذین یقولون لا نُبعث ولا یوقنون یعنی اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہم پھر نہ اٹھائے جائیں گے اس لئے کہ وہ اٹکل سے یہ کہتے ہیں خود ان کو اس کا یقین نہیں ہے کیوں کہ ایسا یقین یا تو مشاہدے سے حاصل ہوتا ہے یا دلیلِ عقلی سے یا مخبر صادق کی خبر سے چوں کہ ان کے پاس یہ سب مفقود ہیں اس لئے یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں محض اٹکل سے بلا یقین کہہ رہے ہیں۔

رئیس المفسرین حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ "لعن المرتابون" یعنی شک کرنے والوں پر لعنت کی گئی ہے[2] یعنی امر حق کی مخالفت میں جو لوگ ضد و عناد اور ہٹ دھرمی سے محض اٹکل پچو باتیں بنایا کرتے تھے ان کو یہ بد دعا ہے کہ ان پر لعنت ہو۔

فقیر کا خیال ہے کہ قرآن حکیم کی رو سے انسان محض اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ اچھے کام کرے، مگر خدا کے پاس اچھے کام وہی ہیں جو اس قانون کے بموجب ہوں جس کا دوسرا نام شریعت ہے اور شریعت پر عمل کرنا بھی اس وقت

[1] محیط المحیط۔ [2] تفسیر ابن جریر جلد ۲۶ صفحہ 119۔

فائدہ دیتا ہے جبکہ حسب ذیل شرائط پوری ہوں :۔

(۱) عمل کرنے والا خدا کی وحدانیت کا دل سے یقین اور زبان سے اقرار کرے یعنی الوہیت و ربوبیت کو صرف اسی ایک ذات میں منحصر اور اس کو وحدہ لاشریک لہ مانے۔ (توحید)

(۲) صاحب شریعت یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم المرسلین و خاتم النبیین ہونے کا زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کرے (رسالت)

(۳) قرآن مجید کے کامل اور خدا کی فرستادہ کتاب ہونے پر ایمان لائے۔

(۴) قیامت اور سزا و جزا پر ایمان رکھتا ہو۔

(۵) جن امور پر ایمان لانا ضروری ہے ان کے ایقان و اقرار کے بعد جو عمل کرے وہ نیت اور ارادے سے خالصاً لوجہ اللہ کرے اور ہر عمل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات کو اپنے لئے اسوۂ حسنہ قرار دے۔

ان پانچ شرطوں کی تکمیل کے بعد شریعت کے مطابق جو عمل ہو وہ عمل صالح اور قابل قبول ہے ورنہ شرعاً کوئی عمل خدا کے پاس قابل قبول نہیں کیونکہ ایمان اصل ہے اور عمل فرع اور فرع بغیر اصل کے ناقابل قبول ہے۔ لہٰذا

جن لوگوں نے ان شرائط کی تکمیل نہیں کی اور جو ان امور پر ایمان نہیں لائے
بلکہ ضد و عناد سے اٹکل پچو باتیں بناتے رہے انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد
ہی پورا نہ کیا اور جب مقصد حیات ہی پورا نہ ہوا تو ان کی یہ زندگی نہیں بلکہ
قتل ہے کیوں کہ یہ ان کا خود کردہ فعل ہے ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

اگر اسی زجر و تنبیہہ پر یہ سارا معاملہ ختم ہو جاتا
تو چنداں قباحت نہ تھی۔ لیکن یہ بات اسی حد تک نہیں رہی بلکہ
ان کو اس انکار و عناد کی سخت ترین سزا دی گئی کیوں کہ روحانیات میں
اعلیٰ ترین مرتبہ قُرب الٰہی اور سب سے بدترین مرتبہ اللہ سے دوری ہے
جس کو عربی میں "لعنت" کہتے ہیں ۔ چنانچہ شیطان نے جب خدا کی
نافرمانی کی تو اس کو یہی سزا دی گئی کہ ان علیک لعنتی الی یوم الدین۔
پس کسی پر لعنت بھیجنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کو خدا نے اپنے سے دور اور اس
مردود ازلی کے گروہ میں داخل کر دیا اور اس کا حشر بھی اسی کے ساتھ ہو گا
جس کو پہلے سے ہی بتا دیا گیا ہے کہ دوزخ کو تجھ سے اور تیرے پیرؤں سے
بھر دوں گا ۔ اس کے بعد ان منکرین خدا و رسول اور متبعین نفس و شیطان
کا دوسرا وصف بیان فرماتا ہے ۔ کہ

الذین هم فی غمرة ساهون	یعنی یہ لوگ وہ ہیں جو آخرت کو بھول گئے ہیں۔ ان کے دلوں پر

جہل و ضلالت کا زنگ چڑھ گیا ہے۔ ان کی آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑ گئے ہیں۔ ان کی عقلوں پر تاریکی چھا گئی ہے یہ اپنے اقرار ازلی کو بھول گئے۔ انجام سے بے خبر۔ ایمان سے بے بہرہ۔ عمل سے کورے۔ حقیقت اور ایک اٹل حقیقت کا مذاق اڑاتے ہیں۔

یسئلون ایان یوم الدین	اور پوچھتے ہیں کہ قیامت کب ہوگی ان ناعاقبت اندیش احمقوں کے

اس نامعقول استہزائی سوال کا جواب ان ہولناک الفاظ میں ادا فرماتا ہے کہ

یوم هم علی النار یفتنون	یعنی اس دن وہ آگ میں جھونکے جائیں گے اور عذاب کے فرشتے

ان سے کہیں گے کہ

ذوقوا فتنتکم هذا الذی کنتم به تستعجلون	یعنی اپنی فتنہ انگیزی

کا مزہ چکھو یہ وہی چیز ہے جس کے لئے تم جلدی کر رہے تھے۔ عکرمہؒ کہتے

ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان کو آگ میں عذاب دیا جائے گا یعنی وہ آگ میں جلائے جائیں گے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ سونے کو جب آگ میں ڈالا جاتا ہے تو کہتے ہیں فُتن (الذھب) حافظ ابن جریر بھی اسی کو ترجیح دیتے ہیں[1] یعنی منکرین قریش جو دنیا اور اس کے مزخرفات میں پھنس کر قبول حق سے انکار کرتے اور جزا و آخرت کا مذاق اُڑانے کے لئے پوچھ رہے ہیں کہ قیامت کب آئے گی اور اعمال کا بدلہ کب ملے گا تو اس کا جواب رب العالمین نے اس سورۃ کے آغاز میں ایک نہیں چار قسمیں کھا کر دے دیا کہ وہ ضرور آئے گی اور مقررہ وقت پر آئے گی۔ اب اگر وہ اس پر بھی نہ مانیں تو ان کے اس سوال کا جواب دوزخ کے فرشتے ان کو آگ میں جھونک کر اس وقت دیں گے کہ یہ وہی عذاب ہے جس کا تم کو یقین نہ تھا جس کا تم مذاق اڑاتے تھے اور جس کے لئے تم جلدی کرتے تھے۔ یہ جواب ایسا ہوگا جس سے نہ تو انکار کی گنجایش رہے گی اور نہ توبہ و ایمان کا وقت باقی رہے گا۔ اس لئے وقت کو غنیمت سمجھو اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ خدا اور رسول خدا پر ایمان لاؤ اور ان کی اطاعت کرو۔

منکرین کے انکار اور ان کے انجام کو بیان فرمانے کے بعد مومنین

---

[1] تفسیر ابن جریر جلد ۲۶ صفحہ ۱۲۱ ۔

دمتقین کا انجام اور ان کی جزاء کو بیان فرماتا ہے۔ یعنی ترہیب کے بعد ترغیب ہے تاکہ جن دلوں میں صلاحیت قبول پنہاں ہے وہ اجاگر ہو جائے اور کم از کم ان نعمتوں سے بہرہ اندوز ہونے کے شوق میں راہ ہدایت اختیار کریں۔ اور خود عام مومنین بھی آخرت میں مدارج علیا حاصل کرنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کریں اور اپنی حیات دنیوی سے جس قدر فائدہ اٹھا سکتے ہیں اٹھا لیں کیوں کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّٰتٍ وَعُيُونٍ ۙ ءَاخِذِينَ مَآ ءَاتَىٰهُمْ 51-15
رَبُّهُمْ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا۟ قَبْلَ ذَٰلِكَ مُحْسِنِينَ ۞ كَانُوا۟ قَلِيلًا 51-16
مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ ۞ وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ 51-17
51-18
وَفِىٓ أَمْوَٰلِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُومِ ۞ 51-19

بے شک پرہیزگار باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔ ان کا پروردگار جو ان کو عطا فرمائے وہ اس کو لے رہے ہوں گے۔ بے شک یہ لوگ اس سے پہلے نکوکار تھے۔ رات کو تھوڑی دیر سویا کرتے تھے۔ اور سحر کے وقت مغفرت طلب کیا کرتے تھے اور ان کے مال و دولت میں سوال کرنے والوں اور (تنگ دست) سوال نہ کرنے والوں (دونوں)

کا حق تھا۔

ان المتقین فی جنت وعیون	متقی وہ شخص ہے جو تقویٰ اختیار کرے اور تقویٰ کے معنی پرہیزگاری

کے ہیں اور عرف شریعت میں اس سے مراد حفظ النفس عما یوثم یعنی شریعت میں گناہوں سے بچنے کو تقویٰ کہتے ہیں[1] مطلب یہ ہے کہ پرہیزگاری کو تقویٰ اور پرہیزگار کو متقی کہتے ہیں۔ تقویٰ کے مراتب مختلف ہیں:۔

(۱) کفر و شرک سے پرہیز کرے۔ یہ پہلا اور سب سے ادنیٰ مرتبہ ہے۔

(۲) گناہوں سے پرہیز کرے یعنی منہیات سے پرہیز کرے اور اوامر کی خلاف ورزی ترک کردے۔

(۳) مکروہات و محظورات سے بچے۔

(۴) مشتبہ کو چھوڑ کر غیر مشتبہ کو اختیار کرے۔

(۵) اگر دو بھلائیوں میں سے ایک کو اختیار کرنے پر مجبور ہو تو مرجوح کو چھوڑ کر راجح یعنی اولیٰ کو اختیار کرے یعنی سنت غیر موکدہ کے مقابلہ میں سنت موکدہ کو اور مندوب کے مقابلہ میں مستحب کو اختیار کرے۔

(۶) اگر دو برائیوں میں سے کسی ایک کے اختیار پر مضطر ہو تو کمتر برائی کو

[1] مفردات راغب ص ۵۵۲ مطبوعہ مصر

اختیار کرے۔

(۷) بعض مباحات سے بھی پرہیز کرے کیوں کہ ارشاد مبارک ہوتا ہے کہ الحلال بین الحرام بین ومن رتع حول الحمی فحقیق ان یقع فیہ[1]۔

(۸) دنیا یعنی ہر اس چیز سے پرہیز کرے جو خدا کی یاد سے غفلت پیدا کرنے والی ہے۔

(۹) ماسوی اللہ سے پرہیز کرے یعنی اپنے قلب کو خدا کے لئے غیر خدا سے خالی کرلے۔

(۱۰) خود اپنے علم سے بھی پرہیز کرے یعنی اپنے خالق کی یاد میں اس طرح محو ہو کہ ذاکر کو خود اپنی اور اپنے ذکر دونوں کا شعور باقی نہ رہے۔ مگر خیال رہے کہ یہ علم کی گھاٹی بقول امام غزالیؒ سالک کے لئے سب سے بڑی گھاٹی ہے۔ وللہ در من قال ؎

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بیخبری رہی

سالک جب اس مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے تو اس کا علم اور اس کا ارادہ

[1] مفردات راغب ص ۵۵۲ مطبوعہ مصر

خداکے علم اور خداکے ارادے میں فنا ہو جاتے ہیں اور مشیت ایزدی کے تحت اس کی حالت کالمیت فی ید الغاسل کی سی ہو جاتی ہے۔

ذالك فضل الله يوتيه من يشاء والله ذوالفضل العظيم۔

ان مراتب مختلفہ کے لحاظ سے اہل جنت کے مدارج بھی مختلف ہوں گے اس لئے فرماتا ہے کہ

اٰخذین ما اٰتٰھم ربھم	یعنی متقیوں کو ان کا پروردگار جو عطا فرمائے وہ لے رہے ہوں گے۔ اس سے

ظاہر ہوا کہ جنت میں ہر متقی کو اس کے مرتبے کے لحاظ سے سرفرازی ہوگی۔

اس کے بعد اپنے مقبول بندوں کی تعریف و توصیف میں فرماتا ہے:

انھم کانوا قبل ذالك محسنین۝	بے شک یہ لوگ اس سے پہلے بھی نکوکار تھے یعنی دنیا میں بھی

نکوکار تھے۔ اس لئے اللہ تبارک و تعالیٰ ان کو جو نعمتیں عطا فرما رہا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے اپنی عبادت و ریاضت اور نفس کشی سے ان نعمتوں کو قبول کرنے کی صلاحیتیں بھی پہلے سے پیدا کرلی تھیں۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے جس نے کاشت

نہ کی اس نے اپنی عمر ضائع کی اور کاشت کرنے والوں میں بھی جس نے جس
چیز کی کاشت کی اس کو وہی ثمرہ ملے گا۔ جس نے گیہوں بویا وہ گیہوں حاصل
کرے گا اور جس نے جوار بویا وہ جوار کاٹے گا۔ اور جس نے زعفران کی
کاشت کی وہ زعفران حاصل کرے گا۔ جوار بونے والا زعفران کا ثمرہ
نہیں حاصل کرسکتا۔ بس اسی پر اہل جنت کے مراتب کے فرق کا بھی اندازہ
کرو۔ اس واسطے اللہ تعالیٰ نے جنت اور عیون کے بعد کسی خاص چیز کی صراحت
نہیں فرمائی بلکہ ایک عام لفظ فرمایا کہ ان کا پروردگار ان کو جو عطا
فرمائے گا وہ لے رہے ہوں گے۔ بے شک سب خدا کی مخلوق ہیں اور محض
اس حیثیت سے رب کو اُس سے یکساں نسبت ہے مگر فیضان الٰہی بہ لحاظِ
استعداد ہوتا ہے ع دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر۔

اس کے بعد اپنے ان بندوں کے تین اوصاف علیحدہ علیحدہ بیان فرماتا ہے۔

(۱) کَانُوْا قَلِیْلًا مِّنَ الَّیْلِ مَا یَھْجَعُوْنَ	یہ رات کو تھوڑی دیر سویا کرتے تھے حضرت ابن عباسؓ

اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ما یاتی علیھم لیلۃ ینامون حتی
یصبحوا لا یصلون فیھا یعنی صحابہ کرامؓ پر کبھی کوئی رات ایسی نہیں

گزری کہ بغیر نماز پڑھے وہ رات بھر سوتے رہے ہوں۔ خیال رہے کہ اس نماز سے مراد عشاء کے فرض و واجب نہیں بلکہ اس سے مراد نوافل تہجد ہیں اس کے بعد صحابۂ کرام کا دوسرا وصف بیان فرماتا ہے۔

(۲) وبالاسحارھم یستغفرون	اور وہ سحر کے وقت مغفرت طلب کیا کرتے ہیں۔ حضرت ابن عمرؓ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ یستغفرون کے معنی یُصلون ہیں۔ یعنی یہاں استغفار سے نماز مراد ہے۔ اور ابن مردویہ حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آخر شب میں تہجد پڑھنا مجھے زیادہ پسند ہے کیوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے کہ "وبالاسحارھم یستغفرون"۔

صحابہ کرامؓ کے متعلق "رات کو کم سوتے ہیں" بیان فرما دینے کے بعد ان کے اس وصف کو خاص طور پر علیحدہ بیان فرمانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ رات کے آخر حصے میں چوں کہ عموماً نیند کا غلبہ ہوتا ہے اور جاگنا نفس پر شاق گزرتا ہے اس لئے صحابہ کرام کی ادا اُس مالکِ بے نیاز کو پسند آئی کہ لوگ جب خوابِ غفلت کے مزے لیتے ہیں اُس وقت یہ عاشقانِ مولیٰؓ اپنے

مالک کے آگے سربسجود ہوتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اور صحابہ کرام کی زندگی ہمارے لئے نمونۂ عمل ہے اور یہی وہ راستہ ہے جس کو ہم صراط مستقیم اور ان لوگوں کا راستہ ہونے کا یقین رکھتے ہیں جن پر خدا کا انعام ہے اور جس پر چلنے کی ہدایت کے لئے ہر نماز میں ہم خدا سے دعا کرتے ہیں۔ لہٰذا جو بھائی شب بیداری کے لئے رات کے دو حصے کرتے ہوں ان کو چاہئے کہ رات کے دوسرے نصف میں اور جو رات کے تین حصے کرتے ہوں یعنی دو حصے آرام کرتے اور ایک حصہ شب بیداری کرتے ہوں وہ رات کے اس تیسرے حصے میں تہجد کی نماز ادا کریں کیوں کہ حضورؐ انور کا ارشاد مبارک ہے کہ آخر حصے میں نماز پڑھنا مجھے زیادہ پسند ہے۔

صحابہ کرامؓ کی عبادتِ بدنی کے بعد ان کے تیسرے وصف یعنی ان کی مالی عبادت کو بیان فرماتا ہے۔

(۳) وفی اموالھم حق للسائل والمحروم	اور ان کے مال و دولت

میں سوال کرنے والوں اور (تنگ دست) سوال نہ کرنے والوں دونوں کا

حق ہے۔

سائل سے عرف عام میں وہی شخص مراد ہے جو سوال سے ابتدا کرے اور وہ مستحق ہو۔ مگر محروم سے مراد ابن عباسؓ اور مجاہدؒ کے پاس وہ محارب لڑنے والا ہے جس کا بیت المال میں کوئی حصہ نہ ہو اور نہ وہ کوئی کسب اور پیشہ کرتا ہو جس سے وہ اپنی قوت بسری کر سکے۔ مگر ضحاکؒ کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جس کا مال جاتا رہا ہے۔ ابو قلابہ کا بیان ہے کہ یمامہ میں ایک سیلاب آیا اور ایک شخص کا مال بہالے گیا تو ایک صحابی نے اس شخص کے متعلق فرمایا کہ یہ محروم ہے۔ قتادہ اور زہری کہتے ہیں کہ المحروم الذی لا یسال الناس یعنی محروم وہ ہے جو لوگوں سے نہ مانگے[1]۔

شعبی کہتے ہیں کہ محروم کے معنی میری سمجھ میں نہ آئے۔ ابن جریر نے محروم کے یہ معنی کئے ہیں کہ محروم وہ شخص ہے جس کا کسی ذریعے سے کوئی مال نہ ہو اور اس کا مال جاتا رہا ہو۔ خواہ وہ کمانے کی قدرت رکھتا ہو۔ یا اس کا مال تباہ ہو گیا۔ یا اسی طرح کی کوئی اور آفت

[1] تفسیر ابن کثیر صفحہ ۳۱ بر حاشیہ فتح البیان۔

اس کو پیش آگئی [1]

ام المومنین حضرت بی بی عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس سے مراد وہ محارف (کم نصیب) ہے جس کو کوئی کام نہ ملے [2] یعنی محارب کی بجائے حضرت بی بی عائشہ محارف فرماتی ہیں۔

حافظ ابن کثیر اس آیۃ کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ صحابہؓ کے وصف نماز کو بیان فرمانے کے بعد ان کی زکوٰۃ نیکی اور صلہ رحمی کو بیان فرمایا مگر حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد زکوٰۃ کے سوا وہ مال ہے جو صلہ رحمی یا کسی مہمان کی ضیافت یا کسی محروم کی مدد میں خرچ کیا جائے یعنی حضرت ابن عباس اس سے مالی عبادت نافلہ مراد لیتے ہیں۔ فقیر کے خیال میں بھی یہی مرجح ہے کیونکہ پہلے جس عبادت بدنی کا ذکر فرمایا ہے وہ بھی عبادت نافلہ ہے۔ جہاں بدنی عبادت نافلہ بیان فرمائی وہاں مالی عبادت بھی نافلہ ہی بیان فرمائی واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

اپنے ان مقبول بندوں کی عبادت بدنی اور مالی کو بیان فرما دیا

---

[1] تفسیر ابن کثیر صفحہ ۲۱ برحاشیہ فتح البیان

[2] 〃 〃 〃 〃 〃 〃

ان کے اوقات بیان فرمائے ۔ان کے مال کے مصارف بتائے تاکہ دوسروں کو بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق ہو ۔مگر ان کی معرفت کو نہیں بیان فرمایا حالاں کہ مقصود اصلی یہی ہے جس کی وجہ فقیر کے خیال ناقص میں یہ ہے کہ ہر سالک کی معرفت بجائے خود اس کا ایک ایسا راز ہوتی ہے جس کا اظہار وہ عام طور پر پسند نہیں کرتا چنانچہ سالکوں کے آقا و مولا ہادی اعظم و پیشوائے معظم عارف اکمل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس مقام پر "ما عرفناك حق معرفتك" فرماتے اور معرفت پر "ما" کا پردہ ڈال دیتے ہیں لہذا جب آقا و مولا ہی نے اس قدر احتیاط سے کام لیا تو غلاموں کی کیا مجال ہے کہ وہ اس کے متعلق کچھ کہنے کی بھی جرات کرسکیں ۔بس ہر سالک اس راز کی حفاظت اپنی جان سے زیادہ کرنا چاہتا ہے اس لئے وہ محبوب بے نیاز بھی اپنے پیارے بندوں کے اس راز کو راز ہی رکھنا پسند فرماتا ہے اس لئے اپنے ان مقبول بندوں کی عبادت کا ذکر تو فرما دیا اور معرفت نہیں بیان فرمائی بلکہ اس کے حصول کے صرف طریقے بتا دیئے کہ جو ان پر عمل کرے گا وہ اپنی استعداد کی حد تک معرفت حاصل کرلے گا۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ

51-20 51-21 وَ فِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۙ وَ فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ

یقین کرنے والوں کے لئے زمین میں نشانیاں (موجود) ہیں اور تمہارے

نفوس کے اندر (بھی) کیا تمہیں دکھائی نہیں دیتیں۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ بہ لحاظ عبادت و معرفت اہل جنت کے مدارج مختلف ہیں اور اسی لحاظ سے ان میں قبول نعمات کی استعدادیں بھی مختلف ہیں اور اسی لحاظ سے ان پر حسب مراتب فیضان الٰہی بھی ہوگا۔ اس لئے قرآن حکیم انہیں دو باتوں یعنی عبادت و معرفت پر بار بار توجہ دلاتا ہے اور اس کے طریقے اور ذرائع بیان فرماتا ہے تاکہ ان سے کام لے کر ہر شخص روحانی ترقی حاصل کرے اور اس حیات دنیوی کا اصلی مقصد و منشا پورا ہو۔

قرآن حکیم نے معرفت الٰہی کے دو طریقے بیان فرمائے ہیں:۔

(۱) سیر فی الآفاق۔

(۲) سیر فی الانفس۔

سیر فی الآفاق میں کائنات علوی۔ کائنات جوّ (فضائی) اور کائنات سفلی

تینوں داخل ہیں۔

اس آیتِ مبارکہ میں زمین کی نشانیوں یعنی کائناتِ سفلی پر توجہ دلائی گئی ہے۔ کیوں کہ انسان اسی پر پیدا ہوا۔ اسی میں رہتا سہتا اسی سے اپنی اکثر ضروریات پوری کرتا اور پھر اسی میں فنا ہو جاتا ہے۔ اور پھر اس سے نکل کر اس کو اپنے خدا کے آگے حساب و کتاب دینے حاضر ہونا ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی فرما دیا کہ یہ نشانیاں انھیں لوگوں کے لئے ہیں جو یقین رکھتے ہیں یعنی شک کے مریض اور انکار کے خوگر ان نشانیوں سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ بلکہ یہ معرفت انہیں لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو یقین کی نعمت سے بہرہ ور ہیں اس تخصیص کی وجہ فقیر کے خیال ناقص میں یہ ہے کہ "یقین" اگرچہ کہنے کو ایک چار حرفی اور آسان لفظ ہے جس کے معنی سمجھنے میں بظاہر ایک عامی اور اَن پڑھ کو بھی کسی فکر یا غور و تامل کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مگر حقیقت میں تمام علوم اور مذاہب کا مدار اسی پر ہے۔ بہ الفاظ دیگر گویا یہی وہ نقطہ ہے جس پر ہر علم کی انتہا اور جس سے ہر مذہب کی ابتدا ہوتی ہے اس لئے یہاں بھی اس کی قید لگائی گئی ہے واللہ اعلم بالصواب۔

اسی سبب سے یقین کی تعریف میں علما حکمت۔ علماء شریعت۔ علماء

طریقت میں باہم اختلاف ہے لہٰذا اس آیۃ کی تفسیر میں حسب ذیل امور غور طلب ہیں :۔

(۱) یقین کے لغوی معنی اور اس کی اصطلاحی تعریف ۔
(۲) موجبات یقین یعنی کن چیزوں سے یقین حاصل ہوتا ہے۔
(۳) مراتب یقین ۔
(۴) اس آیتِ کریمہ میں کن امور کو نشانیوں سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔
(۵) یہ نشانیاں کن امور کی رہنمائی کرتی ہیں۔

یقین کے لغوی معنیٰ

لسان العرب میں لکھا ہے کہ الیقین العلم وازاحۃ الشک وتحقیق الامر۔ وقد ایقن یوقن ایقاناً فھوموقن۔ والیقین نقیض الشک والعلم نقیض الجھل۔

علّامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ الیقین من صفت العلم فوق المعرفۃ والدرایۃ واخواتھا۔ یقال علم یقین ولا یقال معرفۃ یقین وھوسکون الفھم مع ثبات الحکم وقال علم الیقین وعین الیقین وحق الیقین وبینہا

فروق ۔ یقال استیقن وایقن قال تعالیٰ ان نظن الاظنا وما نحن بمستیقنین وفی الارض آیات للموقنین لقوم یوقنون ۔

یقین کے اصطلاحی معنی

الیقین بالقاف کالکریم ھو فی عرف علماء الرسوم الاعتقاد الجازم المطابق الثابت ای الذی لا یزول بتشکیک المشکک ۔ فبالاعتقاد خرج الشک وبالجازم الظن وبالمطابق الجھل المرکب وبالثابت اعتقاد المقلد کذا فی شرح شرح النخبۃ فی بحث التواتر الخبر ۔

"وبالآخرۃ ھم یوقنون" کی تفسیر میں قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ یقین وہ علم ہے جو نظر و استدلال سے حاصل ہوتا ہے اس لئے خدا کا علم اس وصف سے موصوف نہیں ہوتا

اعلم ان الیقین اعتقاد بسیط بالحقیقۃ وقال فی القطبی ان الیقین ھو اعتقاد التی بانہ کذا مع اعتقادہ بانہ لا یمکن ان یکون الا کذا ۔ اعتقاداً مطابقاً ثابتاً

غیر ممکن الزوالِ فالقید الاول یخرج الظن والثانی الجهل المرکب والثالث اعتقاد المقلد[1]۔

یعنی یقین دو اعتقادوں سے مرکب نہیں ہوتا بلکہ یقین ایک بسیط اعتقاد ہوتا ہے مگر یہ ایسا اعتقاد ہوتا ہے کہ اگر معتقد اس پر اس طرح توجہ کرے کہ اس کا یہ اعتقاد واقعے کے مطابق ہے یا نہیں تو اس اعتقاد کی عدم مطابقت کا احتمال بھی پیدا نہ ہو۔ بخلاف ظن یعنی گمان کے جس میں ایک نقیض کا حکم ہوتا ہے لیکن دوسرے نقیض کا احتمال بھی باقی رہتا ہے لہٰذا شک ظن۔ وہم اور جہل مرکب اور تقلید مخطی و مصیب دونوں کی تصدیق اس سے خارج ہو جاتی ہے۔

موجبات یقین

یعنی جن سے یقین حاصل ہوتا ہے وہ قضایا ہیں جن سے تصدیق یقینی حاصل ہوتی ہے کیوں کہ قیاس یقینیات سے مرکب ہوتا ہے خواہ وہ یقینیات بدیہی ہوں یا ایسے نظری ہوں جن کی انتہا بدیہی پر ہو۔

عام طور پر فلاسفہ کے پاس بدیہیات کی حسب ذیل چھ قسمیں مشہور ہیں

---

[1] کشاف اصطلاحات الفنون جلد ثانی صفحہ (۱۵۳۵)۔

(۱) **اولیات** :۔ یعنے وہ قضایا جن پر محض توجہ یا ان کا تصور کرنے سے بغیر کسی واسطے کے یقین حاصل ہو جاتا ہے۔ جیسے کُل جزو سے بڑا ہے۔

(۲) **فطریات** :۔ یعنی وہ قضایا جن میں ایک واسطے کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ واسطہ ذہن سے کبھی غائب نہیں ہوتا جیسے چار جُفت ہے۔

(۳) **حدسیات** :۔ یعنی وہ قضایا جن میں ذہن بغیر حرکت فکری کے مَبداء سے مُنتہاء تک ایک دَم میں پہنچ جاتا ہے۔ جیسے انبیاءؑ اور اولیاءؒ کے علوم ہوتے ہیں۔

(۴) **مشاہدات** :۔ یعنی وہ قضایا جن میں مشاہدہ اور حواس کے واسطے سے حکم ہوتا ہے۔ ان کی دو قسمیں ہیں۔ اگر حواسِ ظاہری کے واسطے سے حکم ہو تو ان کو حسیات کہتے ہیں اور اگر حواس باطنی کے واسطے سے حکم ہو تو ان کو وجدانیات کہتے ہیں۔

(۵) **مجربات** :۔ یعنی وہ قضایا جن میں تکرار مشاہدہ کی بنا پر حکم لگایا جاتا ہے۔ جیسے کونین ملیریا کے لئے مفید ہے۔

(۶) **متواترات**:- یعنی وہ قضایا جن میں کسی ایسی جماعت کی خبر کے واسطے سے حکم لگایا جاتا ہے جس کا جھوٹ پر متفق ہو جانا عقلاً یا کم از کم عادۃً محال ہو۔

بعض لوگوں نے وہمیات کو بھی اس میں داخل کر کے ان کی تعداد سات بتائی ہے۔ بعض نے ان کو اوّلیات اور حسیات میں منحصر کر دیا ہے اور فطریات کو اولیات میں باقی اور اقسام کو حسیات میں شامل کر دیا ہے۔ اور حسیات سے یہ مراد لی ہے کہ جس میں حس کا دخل ہے اور بعض لوگوں نے ان کی تین ۳ قسمیں بیان کی ہیں۔ اولیات ۱ ۔ حسیات ۲ ۔ وجدانیات ۳ ۔ مگر یہ سب لفظی بحثیں ہیں البتہ اس پر سب متفق ہیں کہ انہیں قضایا سے برہان کی ترتیب ہوتی ہے یا ان پر برہان کی تحلیل ہوتی ہے اور برہان کی تعریف شیخ الرئیس کے الفاظ میں یہ ہے :

البرھان قیاس مولف من یقینیات لانتاج یقینی والیقینیات اِمّا الاولیات ۱ وما جمع معھا واِمّا التجربیات ۲ واِمّا المتواترات ۳	برہان وہ قیاس ہے جو یقینیات سے مرکب ہو تاکہ یقینی نتیجہ نکلے اور یقینیات یا تو اولیات ۱ اور اسی قبیل کے قضایا ہوں گے یا تجربیات ۲ یا متواترات ۳

واما المحسوسات وقد فهمناها واما الذائعات والمقبولات والمظنونات خارجة عن هذه الجملة۔ [1]	یا محسوسات ہوں گے جن کو ہم سمجھا چکے ہیں۔ رہے ذائعات، مقبولات اور مظنونات تو وہ ان تمام سے خارج ہیں۔

اور سید شریف[2] کہتے ہیں کہ :۔

البرهان هو القياس المركب من اليقينيات سواء كانت ابتداءً وهي الضروريات او بواسطة وهي النظريات	برہان وہ قیاس ہے جو یقینیات سے مرکب ہو۔ اگر یہ ابتدائی ترکیب ہو تو ان قضایا کو ضروریات کہیں گے اور بالواسطہ ہو تو ان کو نظریات کہیں گے۔

الحاصل یہ کہ برہان سے یقین کا حاصل ہونا ایک متفقہ امر ہے۔ اس لئے فلسفہ کی ہدایت ہے کہ :۔

لما كان ذات الانسان عبارة عن النفس الناطقة فقط اذهي الجزء الاشرف	چونکہ انسان سے مراد محض نفس ناطقہ ہے کیوں کہ یہی اس کا اشرف جز ہے لہذا اصل مقصد اسی کی تکمیل ہے اور

[1] النجات للشیخ الرئیس مطبوعہ مصر صـ۱۰۳　[2] تعریفات سید

فالمقصود الاصلی تکمیلھا وکمالھا مکسوب بمعرفتہا۔ وھی انما تحصل من القیاس النفسی۔ والقیاس النفسی ھو البرھان۔ فالواجب علی الانسان اولاً معرفۃ البرھان[1]	نفس ناطقہ کا کمال معرفت سے حاصل ہوتا ہے اور معرفت قیاس نفسی ہی سے حاصل ہوتی ہے اور یہی برہان ہے لہٰذا انسان کا پہلا فرض برہان کی معرفت ہے۔

مذکورہ بالا اقتباسات کو غور سے پڑھو تو معلوم ہوتا ہے کہ بخلاف سائر حیوانات انسان کو قدرت نے محض اپنے فضل وکرم سے منجملہ اور قوتوں کے ایک قوت نظری بھی عطا فرمائی ہے جس کے ذریعے سے انسان امور معلومہ کو ترتیب دیکر ایک غیر معلوم بات حاصل کرتا ہے اور یہی قوت انسان کو دوسرے حیوانات سے ممتاز کرتی ہے۔ اس سے کام لینا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔

ارسطو کا بڑا کارنامہ صرف یہ ہے کہ اس نے اس ترتیب کا ایک قانون مدوّن کر دیا جس کو منطق کہتے ہیں۔ مگر اس میں فلاسفۂ اسلام نے

[1] شرح مرقاۃ صفحہ ۱۹۱ مطبوعہ مطبع انتظامی۔

ایسی ایسی موشگافیاں کیں اور ایسے ایسے نکتے پیدا کئے کہ خدا کی قدرت سے اگر آج ارسطو پھر زندہ ہو کر آجائے تو اس کی تحصیل و تکمیل کے لئے خود اس کو علماء اسلام کے آگے زانوئے ادب تہ کرنا پڑے۔ متون۔ شروح۔ حواشی کا اتنا بڑا دفتر بن گیا ہے جس کے مطالعہ کے لئے کافی وقت اور صلاحیت درکار ہے۔

اسی قوت نظری کی شقاوت کے سبب۔ انسان حق سے برگشتہ اسی کی سعادت سے حق سے وابستہ اور اسی کی برکت سے وہ حق کا وارفتہ ہو جاتا ہے ؎

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست

در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

عشق را با ہر دلے نسبت بہ قدر جوہر است

قطرہ بر گل شبنم و در قعرِ دریا گوہر است

فلسفہ کا دعویٰ ہے کہ انسان[۱] سے مراد صرف نفس ناطقہ ہے اور[۲] اصلی مقصود نفس ناطقہ کی تکمیل ہے جو معرفت[۳] سے حاصل ہوتی ہے اور معرفت[۴] قیاس نفسی ہی سے حاصل ہوتی ہے اور اسی قیاس[۵] نفسی کا نام برہان ہے۔ ان

پانچوں مقدمات کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ انسانیت کی تکمیل بغیر منطق کے نہیں ہو سکتی کیوں کہ مقدمات برہان کی صحت ترتیب جاننے کے لیے منطق کا جاننا بھی ضروری ہے۔ نعوذ باللہ اگر اس کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا حیرت ہوتی ہے کہ قرون اولیٰ بلکہ خود عہد نبویؐ میں بھی تکمیل انسانیت کے اس پہلے فرض کی طرف کسی نے بھی توجہ نہ کی۔ نہ تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے اس کا خیال فرمایا۔ نہ جبریل علیہ السلام نے اس کی طرف توجہ دلائی نہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے متعلق کوئی حکم یا کم از کم کوئی ہدایت اشارۃً کنایۃً ہی فرمائی۔ اس بھول کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحابہؓ کرامؓ بجائے منطق کے نمازیں پڑھتے رہے اور تعجب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس پر بھی ان کی تعریف وتوصیف میں آیتیں نازل اور بار بار اظہارِ خوشنودی فرماتا رہا یہاں تک کہ یہ مبارک دور ختم ہو گیا اور تکمیل انسانیت کا یہ پہلا فرض غفلت کی الماری ہی میں بند رہ گیا۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا. فمن یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ استغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین۔

اب دیکھنا یہہ ہے کہ علماء طریقت کی اصطلاح میں یقین کس کو کہتے ہیں اور اس کا حصول کس طرح ہوتا ہے۔ غور سے پڑھئے اور انصاف کیجے: والیقین عند السالکین قیل ھو تحقیق التصدیق بالغیب بازالۃ کل ظن یعنی گمان کو زایل کر کے تصدیق غیبی کی تحقیق کا نام یقین ہے۔ حضرت سہیل تستری فرماتے ہیں کہ مکاشفہ ہی یقین ہے اور عطاؒ فرماتے ہیں کہ ما زال عنہ المعارض علی دوام الوقت یعنی یقین وہ ہے جس سے معارض ہمیشہ کے لئے زایل ہو جائے۔ اور حضرت ذوالنونؒ فرماتے ہیں کہ جس کو آنکھیں دیکھیں وہ علم کی طرف منسوب ہوگا اور جس کو دل جان لے وہ یقین کی طرف منسوب ہوگا بعض لوگ کہتے ہیں کہ مشاہدہ ہی یقین ہے اور بعض کا قول ہے کہ مومن کے دل میں نور حقیقت کے ظہور کو یقین کہتے ہیں۔

والیقین نور عند کشف الحجاب و بالحقیقۃ ھما نور واحد الا انہ اذا کان من وراء الحجاب یقال لہ نور الایمان واذا کان عند رفع الحجاب صار یقینا۔ جیسے ایک بینا اور نابینا دونوں آفتاب کے وجود کی خبر دیں تو بینا بخلاف نابینا کے اپنے

مشاہدہ کی بنا پر خبر دے گا۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ اہل طریقت کے پاس
یقین کشف وشہود سے حاصل ہوتا ہے اور کبھی زایل نہیں ہوتا۔ کوئی نقض
اور کوئی دلیل اس میں تزلزل نہیں پیدا کرسکتی۔ نیز ایمان اور یقین دونوں
درحقیقت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں اور ان میں محض اعتباری فرق ہے۔

یہ علم لدنی کا مدرسہ ہے جس میں اشکال اربعۃ اُن کے شرائط انتاج
اور ضروب منتجہ کوئی اہمیت نہیں رکھتے یہاں برہان لِمّی واِنّی کی کوئی
قدر وقیمت نہیں بلکہ یہاں تزکیۂ نفس اور تصفیہ قلب کی ضرورت ہے
یہاں ذہن کے اندر کوئی بات نہیں بٹھائی جاتی۔ یہاں امور معلومہ کو
ترتیب نہیں دیا جاتا بلکہ یہاں دل کو خدا کے لئے غیر خدا سے خالی کرلیا جاتا
ہے۔ اس مدرسہ کا ہر طالب علم سالک اور اس کا استاد عارف و مرشد کہلاتا
ہے جو اپنے مریدوں کو ریاضت ومجاہدہ کا طریقہ بتاتا اور ان کے منازل
کو اپنی نگرانی میں طے کراتا ہے۔ اس کے بعد ہر سالک ہر وقت فیضان الٰہی
کا انتظار کرتا ہے تاکہ والّذین جاھدوا فینا لنھدینھم سُبلنا
کا وعدہ پورا ہو کیوں کہ ان اللہ لا یخلف المیعاد۔

اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں کونسا طریقہ انسب واولیٰ ہے۔

اس کے جواب میں فقیر اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا بلکہ آپ کے سامنے امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ کے دو واقعات پیش کرتا ہے۔

امام رازیؒ کی خصوصیت یہ ہے کہ امام صاحب اپنے تبحر علمی۔ خداداد ذہانت اور تحقیق و انتقاد کی بدولت غیر معمولی شخصیت کے حامل ہیں اور صرف فلاسفہ اور متکلمین ہی نہیں بلکہ تمام دنیائے اسلام بھی آپ کا ادب احترام کرتی اور آپ کو امام کے لقب سے یاد کرتی ہے۔ امام صاحب نے اپنے قلم سے اسلام کی جو بے بہا خدمات انجام دی ہیں وہ ہر طرح لائق قدر و احترام ہیں ان کی تصانیف خصوصاً تفسیر کبیر کو اہل علم سر آنکھوں پر رکھتے ہیں اور اس تفسیر میں بھی آپ اس کے حوالے پڑھ چکے ہیں اور انشاء اللہ آگے بھی پڑھتے رہیں گے۔

خدائے تعالیٰ امام صاحبؒ کی سعی مشکور فرمائے اور ان کے مدارج اخروی میں ترقی فرماتا رہے۔

امام ممدوح کی خدمات علمی کا خراج عقیدت ادا کرنے کے بعد جس کے وہ حقیقتاً مستحق ہیں۔ امام صاحب موصوف کی زندگی کے دو خاص واقعات فقیر نقل کرتا ہے جن سے آپ کو ارباب نظر و استدلال و اہل طریقت دونوں کے

طریقوں کے تقابلی مطالعہ میں سہولت ہوگی اور خود آپ کا ذوق سلیم نہایت آسانی سے اس کا فیصلہ کر سکے گا کہ ان دونوں طریقوں میں کون سا طریقہ بہتر و برتر ہے۔

پہلا واقعہ حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ کا ایک مکتوب[1] ہے جو محض خیر خواہی سے امام رازیؒ کے نام لکھا گیا ہے۔

اس خط کو بہاء الدین عاملی نے اپنی کشکول میں نقل کیا ہے۔ اس خط کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں اور قسم قسم کی باتیں مشہور ہیں۔ شاید بہت کم لوگوں نے اس کو دیکھا ہو۔ فقیر فٹ نوٹ میں اصل خط ترجمہ کے ساتھ درج کر دیتا ہے جس سے معلوم ہوگا کہ یہ ایک نیک نیت کا مخلصانہ مشورہ ہے جو خالصاً لوجہ اللہ پیش کیا گیا ہے جس کے ایک ایک لفظ سے مکتوب الیہ کی ہمدردی اور محبت للّٰہی ظاہر ہوتی ہے۔

اس خط سے دونوں طریقوں کے امتیازی فرق کی بھی بخوبی وضاحت ہو جاتی ہے۔

---

[1] بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ھذہ کتابۃ کتبھا العارف الواصل	عارف و واصل صمدانی شیخ محی الدین ابن عربی نے

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام رازیؒ آخر کار طریقہ نظر و استدلال سے

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

الصمدانی الشیخ محی الدین بن عربی حشرۃ اللہ مع احبتہ الی الامام فخر الدین الرازی رحمہ اللہ تعالیٰ۔

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذی اصطفی وعلی ولی فی اللہ فخر الدین محمد اعلی اللہ ھمتہ و افاض علیہ برکاتہ ورحمتہ (وبعد) فان اللہ تعالیٰ یقول "وتواصوا بالحق" وقد وقفت علی بعض تالیفک وما ایدک اللہ بہ من القوۃ المتخیلۃ والفکر الجید ومتی قعدت النفس عن کسب یدیہا فانہا لا تجد حلاوۃ الجود

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

(خدا ان کا حشر ان لوگوں کے ساتھ کرے جن سے وہ محبت کرتے تھے)۔ یہ خط امام فخر الدین رازیؒ کے نام لکھا ہے۔

سب تعریفیں خدا ہی کے لئے ہیں۔ اللہ کے برگزیدہ بندوں اور میرے اللہ واسطے کے دوست فخر الدین محمد پر سلام ہو۔ خدا ان کی ہمت بلند کرے اور ان کو اپنی رحمت اور برکتوں کا فیض پہنچائے۔ اس کے بعد معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایک دوسرے کو حق بات کی وصیت کرتے رہیں۔ آپ کی کچھ تالیفیں میرے دیکھنے میں آئیں۔ خدا نے آپ کی قوت متخیلہ اور عمدہ فکر سے جو تائید فرمائی ہے اس سے میں نے آگاہی حاصل کی نفس جب

ایک حد تک غیر مطمئن ہو گئے تھے اور ان کے اندر وہ اضطراب اور بے چینی پیدا

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

والوھب فتکون ممن اکل من تحتہ والرجل من یاکل من فوقہ کما قال اللہ تعالی "ولو انھم اقاموا التوراۃ والانجیل وما انزل الیھم من ربھم لاکلوا من فوقھم ومن تحت ارجلھم" ولیعلم ولی وفقہ اللہ تعالی ان الوراثۃ الکاملۃ ھی التی تکون من کل الوجوہ لا من بعضھا والعلماء ورثۃ الانبیاء فینبغی للعالم العاقل ان یجتھد لیکون وارثا من کل الوجوہ ولا یکون ناقص الھمۃ وقد علم ولی وفقہ اللہ تعالی ان حسن الطبیعۃ الاحسانیۃ

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

خود کام کرنے سے ہیٹا ہو جاتا ہے تو اس کو جو اور وہب (یعنی بخشش خداوندی) کی حلاوت نہیں ملتی۔ اس کی حالت اس شخص کی سی ہو جاتی ہے جو اپنے نیچے سے (چن چن کر) کھا رہا ہے حالانکہ مرد وہ ہے جو اپنے اوپر سے کھائے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر وہ (یعنی اہل کتاب) توریت اور انجیل اور ان کے پروردگار کی طرف سے جو (کتابیں) ان پر نازل ہوئی ہیں ان کی پابندی کرتے تو وہ اپنے اوپر اور اپنے پاؤں کے نیچے سے کھاتے۔ میرے دوست کو اللہ انہیں نیک توفیق دے یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ کامل وراثت وہی ہے جو سب طرح سے ہو اور جو وراثت

ہو گئی تھی جو عموماً ایک بڑے آدمی کو بہت بڑا آدمی بنانے کا پیش خیمہ ہوتی ہے

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

بما تحملہ من المعارف الالٰھیۃ و قبحھا بضد ذالک فینبغی للعالی الھمۃ ان لا یقطع عمرہ فی معرفۃ المحدثات و تفاصیلھا فیفوتہ حظہ من ربہ و ینبغی لہ ایضاً ان یسرح نفسہ من سلطان فکرہ فان الفکر یعلم ماخذہ و الحق المطلوب لیس ذالک و العلم باللہ خلاف العلم بوجود اللہ فینبغی للعاقل ان یخلی قلبہ عن الفکر اذا اراد معرفۃ اللہ تعالٰی من حیث المشاہدۃ و ینبغی للعالی الھمۃ ان لا یکون تلقیہ

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

بعض وجوہ سے ہو وہ کامل نہیں ہوتی۔ علما انبیا کے وارث ہیں لہذا ایک عقلمند عالم کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ تمام وجوہ سے ان کا وارث ہو پست ہمت نہ بنے۔ میرے دوست کو (اللہ انہیں نیک توفیق دے) یہ معلوم ہی ہے کہ طبیعت احانیہ کی خوبی یہ ہے کہ وہ معارف الٰہی کی حامل ہو اور اس کی ضد اس کی برائی ہے۔ اس لئے بلند ہمت کو چاہیے کہ وہ حادث چیزوں اور ان کی تفصیلات کی معرفت میں عمر ضائع نہ کرے۔ نیز ایک عالی ہمت کو چاہیئے کہ وہ اپنے نفس کو سلطان فکر (یعنی غلبہ فکر) کے پنجہ سے نکال لے۔ کیوں کہ فکر اپنے ماخذ کو

اور اسی اثنا میں ایک دوسرا واقعہ بھی پیش آیا جو سونے پر سہاگہ کا کام

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

عند هذا من عالم الخيال وهى
الانوار المتجسدة الدالة على
معان وراءها فان الخيال ينزل
المعانى العقلية فى القوالب الحسية
كالعلم فى صورة اللبن والقرآن
فى صورة الحبل والدين فى صورة
القيد وينبغى للعالى الهمة ان
لا يكون معلمه مونثا لما لا ينبغى
ان ياخذ من فقير اصلا وكل
ما لا كمال له الا بغيره فهو فقير
وهذا حال كل ماسوى الله تعالى
فارفع الهمة فى ان لا تاخذ علما
الا عن الله سبحانه وتعالى

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

جانتی ہے حالاں کہ یہ حقیقی مطلوب نہیں اور
علم باللہ (خدا کا علم) علم بوجود اللہ (خدا کے
وجود کے علم) کے خلاف ہے لہٰذا عقلمند
جب خدا کی ایسی معرفت حاصل کرنی چاہیے
جو مشاہدہ کی حیثیت رکھتی ہو تو اس کو اپنا
دل فکر سے خالی کر لینا چاہیے۔ ایک عالی
ہمت کو چاہیے کہ وہ ایسی معرفت حاصل
کرتے وقت عالم خیال سے کچھ نہ لے کیونکہ
وہ (یعنی جو چیزیں عالم خیال میں آتی
ہیں) وہ جسدی (جسمانی) انوار ہوتے ہیں
جو ان معنی پر دلالت کرتے ہیں جو ان کے
پیچھے ہیں۔ کیوں کہ خیال عقلی معنی کو حسی
قالبوں میں ڈھال لیتا ہے جیسے علم کو دودھ

دے گیا احمد بن مصطفےٰ المتوفی ۹۶۲ھ عرف طاش کبریٰ زادہ نے جس کا تلفظ

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

علی الکشف والیقین واعلم ان
اھل الافکار اذا بلغوا الغایۃ
القصوی اداھم الفکر الی حال
المقلد المصمم فان الامر اجل
واعظم من ان یقف فیہ الفکر
فما دام الفکر موجودا فمن المحال
ان یطمئن العقل ویسکن وللعقول
حد تقف عندہ من حیث قوتھا
فی التصرف الفکری ولھا صفۃ
القبول لما یھبہ اللہ تعالیٰ واذن
ینبغی للعاقل ان یتعرض لنفحات
الجود ولا یبقی ما سوراً فی قید
نظرہ وکسبہ فانہ علی شبہۃ فی ذلک

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

کی صورت میں اور قرآن کو رسی کی صورت میں
اور دین کو قید (بیڑی) کی صورت میں ایک عالی ہمت کا
معلم مونث نہ ہونا چاہئے جیسے کسی محتاج سے
کچھ نہ لینا چاہئے۔ ہر وہ چیز جس کا کمال
اس کے غیر سے حاصل ہو پس وہ محتاج ہے
اور ہر ما سوی اللہ کا یہی حال ہے۔ لہذا آپ
بلند ہمتی سے کام لے کر بہ طریق کشف ویقین
اللہ سبحانہ کے سوا کسی اور سے علم حاصل
نہ فرمائیں خیال رہے کہ اہل افکار جب
انتہائی حد تک پہنچ جاتے ہیں تو ان کو فکر
ایک مقلد جامد کی حالت تک پہنچا دیتی ہے
یہ بات (یعنی معرفت الٰہی) اس سے بہت
اعلیٰ وارفع ہے کہ اس تک فکر کی رسائی ہو سکے۔

بزبان ترکی دانش کوپری ہے اور اس طرح سے یہ علمی دنیا میں

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

ولقد اخبرنی من الفت بہ من
اخوانك ممن له فيك نية حسنة
انه رآك وقد بكيت يوما فسالك
هو ومن حضره عن بكائك فقلت
مسئلة اعتقدتها منذ ثلاثين
سنة تبين لى الساعة بدليل
لاح لى ان الامر على خلاف ما كان
عندى فبكيت وقلت لعل الذى
لاح لى ايضا يكون مثل الاول
فهذا قولك ومن المحال على الواقف
بمرتبة العقل والفكر ان يستريح
او يسكن ولاسيما فى معرفة الله
تعالى فمابالك يا اخى تبقى فى هذه

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

جب تک فکر موجود ہے عقل کو اطمینان وسکون
کا حاصل ہونا محال ہے۔ عقلوں کی بھی ایک حد ہے
جہاں پہنچکر ان کے تصرف فکری کی قوت ختم
جاتی ہے (اور اس کے آگے نہیں بڑھ سکتی اور
اس پر حیرت طاری ہوجاتی ہے) (اور اس کے
سوا) عقل میں عطائے ربانی قبول کرنے کی
بھی صفت ہے پس ایک عقلمند کو چاہیے کہ
وہ اس طرف بڑھے جدھر سے سخاوت کی لپٹیں
آرہی ہیں کسب وفکر کی چاردیواری میں
مقید نہ رہے ورنہ وہ اس کے متعلق شبہ میں
پڑا رہے گا۔ آپ کے چاہنے والے بھائیوں میں سے
ایک صاحب نے جو آپ کے خیر اندیش بھی ہیں
مجھے بتایا کہ انہوں نے ایک دن آپ کو دیکھا کہ

مشہور و معروف ہیں اپنی کتاب مفتاح السعادۃ میں لکھتے ہیں کہ

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

الورطۃ ولا تدخل طریق الریاضات والمکاشفات والمجاهدات والخلوات التی شرعها رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فتنال ما نال من قال فیه اللّٰه سبحانه وتعالیٰ عبدًا من عبادنا آتیناه رحمة من عندنا وعلمناه من لدنا علمًا ومثلك من یتعرض لهذه الخطة الشریفة والمرتبة العظیمة الرفیعة ولیعلم ولی وفقه اللّٰه تعالیٰ ان کل موجود عند سبب وذالك السبب محدث مثله فان له وجهین وجه ینظر به الی سببه ووجه ینظر به الی

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

آپ رو رہے ہیں جس پر ان صاحب نے اور دوسرے لوگوں نے جو اس وقت آپ کے پاس موجود تھے رونے کا سبب دریافت کیا تو آپ نے جواب دیا کہ ایک مسئلہ میں تیس سال سے میرا ایک عقیدہ تھا مگر اس وقت ایک ایسی دلیل ذہن میں آئی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میں جو سمجھے ہوئے تھا وہ غلط تھا۔ اس لئے میرا دل بھر آیا اور خیال ہوا کہ شاید یہ دلیل بھی (آگے چل کر) پہلی ہی جیسی ہو۔ یہ آپ کا قول ہے جو شخص مرتبہ عقل و فکر پر ٹھہر جائے اس کو راحت و سکون حاصل ہونا محال ہے خصوصاً معرفت خدا کے متعلق۔

میرے بھائی آپ کی یہ کیا حالت ہے؟

واعلم ان الامام کان من زمرۃ الفقہاءِ	واضح ہو کہ امام صاحب پہلے فقہا کے زمرے میں تھے
(بقیہ صفحہ گذشتہ)	(بقیہ صفحہ گذشتہ)
موجدہ وھو اللہ تعالیٰ فالناس	آپ کب تک اس قصور میں پڑے رہیں گے اور
کلھم ناظرون الی وجوہ اسبابھم	ریاضتوں۔ مکاشفوں۔ مجاہدوں اور خلوتوں
والحکماء والفلاسفۃ کلھم وغیرہم	کے طریقے میں آپ کب تک داخل نہ ہوں گے
الا المحققین من اھل اللہ تعالیٰ	(حالاں کہ) یہ طریقہ وہ ہے جس کو رسول اللہ
کالانبیاء والاولیاء والملٰئکۃ علیھم الصلوٰۃ	صلی اللہ علیہ وسلم نے مشروع فرمایا ہے (اگر
والسلام فانھم مع معرفتھم بالسبب	آپ اس طریقہ سے کام لیں گے) تو آپ کو وہ
ناظرون من الوجہ الآخر الی	حاصل ہو جائے گا جو اس شخص کو حاصل ہوا تھا
موجدھم ومنھم من نظر الی ربہ	جس کے متعلق اللہ سبحانہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ
من وجہ سببہ لا من وجھہ فقال	ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ جس کو ہم نے
حدثنی قلبی عن ربی وقال الآخر	اپنے پاس سے رحمت عطا فرمائی تھی اس کو ہم نے
وھو الکامل حدثنی ربی ومن کان	اپنے پاس سے علم سکھایا تھا۔ ایسی شریف
وجودہ مستفادا من غیرہ فان	خصلت اور ایسا بلند اور عظیم الشان مرتبہ
حکمہ عندنا حکم لا شئ فلیس للعارف	آپ جیسے لوگوں کے شایانِ شان ہے۔

ثم التحق بالصوفیه قصا من اهل	پھر یہ صوفیہ میں مل گئے اور اہل شادہ

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

معول الا اللہ سبحانہ وتعالی
البتۃ واعلم ان الوجہ الالہی
الذی ھو اسم اللہ اسم جامع
لجمیع الاسماء مثل الرب القدیر
والشکور وجمیعھا کالذات الجامعۃ
لما فیھا من الصفات فالاسم اللہ
(تعالیٰ) مستغرق لجمیع الاسماء
فتحفظ عند المشاھدۃ منہ فانک
لا تشاھدہ اصلا فاذا ناجاک بہ
وھو الجامع فانظر بما ناجیک بہ
وانظر المقام الذی تقتضیہ تلک
المناجاۃ او تلک المشاھدۃ
وانظر الی اسم من الاسماء الالھیہ

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

میرے دوست کو (خدا انہیں نیک توفیق دے)
یہ خیال رہے کہ ہر موجود جو کسی سبب کی وجہ موجود
ہوتا ہے اور وہ سبب بھی اسی کی طرح حادث
ہے (یعنی علت و معلول) دونوں حادث
ہوں تو ہر ایسے موجود کی دو صورتیں ہوتی ہیں
اس کی ایک صورت تو وہ ہے جو اس کے سبب کی
طرف ہے اور اس کا دوسرا رخ وہ ہے جو اس
کے موجد کی طرف ہے اور یہی خدائے برتر
ہے۔ مگر سب لوگ اسباب کی صورتوں کی
طرف دیکھ رہے ہیں۔ حکماء اور فلاسفہ وغیرہ
سب اسی فکر میں پڑے ہوئے ہیں مگر محققین
اہل اللہ جیسے انبیاء۔ اولیاء اور ملائکہ
علیہم الصلوٰۃ والسلام سبب کی معرفت کے

المشاهدة وصنف التفسير بعد ذالك ہو گئے۔ آپ نے اس کے بعد تفسیر کبیر لکھی

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

ينظر اليها فذلك الاسم
هو الذي خاطبك او شاهدته
فهو المعبر عنه بالتحول في الصورة
كالغريق اذا قال يا الله فمعناه
يا غياث او يا منجي او يا منقذ
وصاحب لا لم اذا قال يا الله
فمعناه يا شافي او يا معافي وما
اشبه ذلك وقولي لك التحول
في الصورة ما رواه مسلم في صحيحه
ان الباري تعالى يتجلى فينكر
ويتعوذ منه فيتحول لهم
في الصورة التي عرفوه فيها
فيقرون بعد الانكار وهذا

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

ساتھ اس کی دوسری صورت جو موجد کی طرف ہے
اس پر بھی نظر رکھتے ہیں ان میں سے کوئی ایسا
ہے) جو اس (موجد) کی ذات (مطلقہ) کی
حیثیت سے نہیں بلکہ اس (حادث) کا سبب
ہونے کی وجہ سے نظر کرتا ہے تو کہتا ہے کہ میرے
قلب نے میرے رب کے متعلق یہ بات بیان
کی اور دوسرا جو کامل ہے وہ کہتا ہے مجھے
میرے رب نے یہ حدیث بیان کی۔ اور جس کا
وجود غیر سے حاصل ہوا ہو تو ہمارے نزدیک
اس کا حکم "لاشئی" کا حکم ہے (یعنی اس کا
وجود وجود ہی نہیں) لہٰذا عارف کا اعتماد
سوائے خدائے پاک و برتر کے کسی پر ہرگز نہیں
ہونا چاہئے۔

ومن تامل فی مباحثه وتصفح لطائفه	جو اس کے مباحث پر غور کرے اور اس کے

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

هو معنى المشاهدة ههنا والمناجاة
والمخاطبات الربانية وينبغي للعاقل
ان لا يطلب من العلوم الا ما يكمل
به ذاته وينتقل معه حيث انتقل
وليس ذالك الا العلم بالله تعالى
فان علمك بالطب انما يحتاج اليه
في عالم الامراض والاسقام فاذا
انتقلت الى عالم ليس فيه السقم
ولا المرض فمن تداوى بذلك العلم
وكذلك العلم بالهندسة انما يحتاج
اليه في عالم المساحة فاذا انتقلت
منه تركته في عالمه ومضت النفس
ساذجة ليس عندها شئ منه وكذلك الاشتغال

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

واضح ہو کہ وجہ الٰہی یعنے اسم اللہ ایک ایسا
اسم ہے جو تمام اسماء جیسے رب۔ قدیر۔ شکور
اور سب اسماء کا جامع ہے جیسے ذات اپنے
تمام صفتوں کی جامع ہے۔ لہٰذا اسم اللہ بھی
تمام اسماء پر حاوی ہے۔ اس کے شاہدہ کے
وقت تم دیکھو گے کہ تمہیں اس اسم کا مشاہدہ
بالکل نہیں ہو رہا ہے۔ اس لئے جب وہ تم سے
اس کے ذریعہ سرگوشی کرے تو چونکہ یہ اسم
جامع ہے اس لئے یہ دیکھو کہ وہ کس (اسم)
کے ذریعہ تم سے سرگوشی کر رہا ہے اور اس
مقام پر نظر کرو جو اس مناجات (سرگوشی)
یا اس مشاہدہ کا مقتضی ہے اور یہ دیکھو کہ اسمائے
الٰہی میں سے کون سے اسم کی تم پر نظر ہے پس تم

یجد فی اثنائہ کلمات اھل المتصوف من الامور الذوقیۃ	لطائف کو غائر نظر سے دیکھے تو اسکو اس تفسیر میں اہل تصوف کی ایسی باتیں ملیں گی جن کا تعلق ذوقی امور سے ہے۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

بکل علم تترکہ النفس عند انتقالھا الی عالم الاٰخرۃ ینبغی للعاقل ان لا یاخذ منہ الا ما مست الیہ الحاجۃ الضروریۃ ولیجتھد فی تحصیل ما ینتقل معہ حیث انتقل فلیس ذلک الا علمان خاصۃ العلم باللہ والعلم بمواطن الاٰخرۃ وما یقتضیہ مقاماتھا حتی یمشی فیھا کمشیہ فی منزلہ فلا ینکر شیئا اصلا فلا یکون من الطائفۃ التی قالت عند ما تجلی

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

وہی نام ہے جس نے تم سے خطاب کیا ہے یا جس کا تمہیں مشاہدہ ہوتا ہے اور تحول صورت کے اعتبار سے اس کی تعبیر کی جا سکتی ہے۔ جیسے کوئی ڈوبتا ہوا شخص جب یا اللہ پکارتا ہے تو اس کے معنی یا غیاث (فریادرس) یا یا منجی (نجات دینے والا) یا یا منقذ (چھڑانے والے) کے ہوتے ہیں۔ اور کوئی بیمار دکھی جب یا اللہ پکارتا ہے تو اس کے معنی یا شافی یا یا معافی اور اسی طرح کے ہوتے ہیں۔ میں نے آپ سے تحول صورت کا ذکر کیا ہے۔ اس کو مسلم نے اپنی صحیح میں

دوسرا واقعہ	اس کے بعد وہ اُن کو بڑی نہایت وثوق سے ایک تفصیلی روایت نقل کرتے ہیں جس کا ماحصل یہ ہے کہ

(بقیہ خط صفحہ گذشتہ)

لهاربها نعوذ بالله منك لست ربنا نحن منتظرون حتى ياتينا ربنا فلما جاءهم في الصورة التي عرفوها اقروا به فما اعظمها حسرة فينبغي للعاقل الكشف عن هذين العلمين بطريق الرياضة والمجاهدة والخلوة على الطريقة المشروطة وكنت اريد ان اذكر الخلوة وشروطها وما يتجلى فيها على الترتيب شيئا بعد شئ ولكن منع من ذلك الوقت

(بقیہ ترجمہ صفحہ گذشتہ)

روایت کیا ہے کہ باری تعالیٰ کی تجلی ہوگی تو اس کا انکار کیا جائے گا اور اس سے پناہ مانگی جائے گی پھر وہ ان کے لئے ایسی صورت میں متحول ہو جائے گا جس کو وہ پہچانتے ہیں لہٰذا وہ انکار کے بعد اقرار کریں گے اور یہاں مشاہدہ۔ مناجات اور مخاطبات ربانی کے یہی معنی ہیں۔

عقلمند کو چاہیئے انہیں علوم کو حاصل کرے جن سے اس کی ذات کی تکمیل ہو اور وہ جہاں جائے اس کے علوم بھی اس کے ساتھ رہیں۔ مگر سوا علم باللہ تعالیٰ (یعنی معرفت الٰہی) کے کوئی اور علم ایسا نہیں۔

امام فخر الدینؒ رازی المتوفی ۶۰۶ھ کی حضرت نجم الدینؒ کبری المتوفی ۶۱۸ھ

(بقیہ خط صفحہ گذشتہ)	(بقیہ ترجمہ صفحہ گذشتہ)
واعنی بالوقت علماء السوء الذین انکروا ما جھلوا وقیدهم التعصب وحب الظھور والریاسة عن الاذعان للحق والتسلیم له ان لم یمکن الایمان به والله ولی التوفیق انتھی —	آپ کے علم طب کی ضرورت صرف عالم امراض واسقام میں ہے۔ مگر جب آپ ایسے عالم میں چلے جائیں گے جہاں کوئی دکھ ہے نہ بیماری تو وہاں اس علم سے آپ کس کی دوا کریں گے۔ اسی طرح علم ہندسہ کی ضرورت صرف عالم مساحت میں ہے جب آپ اس سے منتقل ہو جائیں گے تو اس علم کو بھی آپ اسی عالم میں چھوڑ جائینگے اور نفس سادہ حالت میں وہاں جائے گا کہ اس کا کچھ بھی اثر اس پہ نہ رہے گا۔ اسی طرح ہر علم کی مشغولیت کا حال ہے کہ نفس جب عالم آخرت میں منتقل ہوگا تو اس علم کو یہیں چھوڑ جائے گا۔ اس لئے عقلمند کو چاہئے کہ ایسے علوم سے صرف ایسی قدر حاصل کرے جس کی

سے ہرات میں ملاقات ہوئی اور دونوں میں علمی مناظرہ ہوا۔ اثنائے بحث میں

(بقیہ ترجمہ خط صفحہ گذشتہ)

احتیاج وضرورت ہے اور ایسا علم حاصل کرنے کی کوشش کرے جو ہر جگہ اس کے ساتھ ساتھ رہے مگر ایسے علم صرف دو ہیں۔ ایک علم باللہ خصوصاً (معرفت خدا) اور دوسرا مواطن آخرت اور اس کے اقتضائے مقامات کا علم تاکہ وہاں وہ اس طرح چلے پھرے جس طرح کوئی اپنے گھر میں چلتا پھرتا ہے۔ اور (وہاں) کسی چیز کا ہرگز انکار نہ کرے اور ان لوگوں میں سے نہ ہو کہ جب ان کے سامنے ان کے رب کی تجلی ہوئی تو انہوں نے کہا کہ "خدا ہم کو تجھ سے بچائے تو ہمارا رب نہیں ہے ہم انتظار کرتے ہیں یہاں تک کہ ہمارا رب ہمارے پاس آئے"۔ پھر ان کے پاس جب وہ اس صورت میں آئے جس کو وہ پہچانتے ہیں تب انہوں نے اس کا اقرار کیا۔

ہائے کیسی حسرتناک بات ہے۔ لہذا عقلمند کو چاہئے کہ ان دونوں علموں کا بطریق ریاضت و مجاہدہ خلوت اور شروط طریقے کے بموجب کشف حاصل کرے میں چاہتا تھا کہ خلوت اور اس کے شرائط اور اس میں جو تجلیات ہوتی ہیں ان میں کی ایک ایک چیز کو یکے بعد دیگرے ترتیب وار بیان کروں مگر وقت اس سے منع کرتا ہے۔ وقت سے میری مراد وہ بڑے علماء ہیں جو ان امور سے انکار کرتے ہیں جن سے وہ جاہل ہیں اور تعصب۔ خودنمائی اور جاہ پسندی نے ان کو حق کے اذعان اور تسلیم سے روک دیا ہے کہ وہ اس پر ایمان نہیں لا سکتے اور اللہ ہی توفیق دینے والا ہے۔ انتہیٰ (خط ختم ہوا)

حضرت نجم الدین کبریٰ نے امام رازی سے پوچھا کہ:۔

ان افتخارك بالعلم واشرف
العلم معرفته الله تعالیٰ فكيف
عرفته تعالیٰ۔ قال بمأة براهين
قال الرجل البرهان لازالة
الشك والله تعالیٰ جعل فی
قلبی نوراً لا يدخل معه الشك
فضلاً عن الحاجة الی البرهان
فاثر هذا الكلام فی قلب الامام
فتاب فی ذالك المجلس علی يده
ودخل الخلوة وفتح الله له
ما فتح وبعد ما خرج عنها
صنف التفسير الكبير[1]

آپ کا طرۂ امتیاز علم ہے۔ اور سب سے اشرف علم خدا کی معرفت ہے لہذا آپ کو خدا کی معرفت کیسے حاصل ہوئی؟

امام صاحب نے جواب دیا کہ سو براہین سے۔ اس کے جواب میں اس شخص (یعنی نجم الدین کبریٰؒ) نے فرمایا کہ برہان شک زائل کرنے کے لئے ہوتی ہے اور خدا نے میرے دل میں ایسا نور پیدا کر دیا ہے کہ اس میں شک داخل نہیں ہوتا برہان کی ضرورت تو در کنار۔ اس کلام کا امام رازی کے دل پر گہرا اثر ہوا اسی مجلس میں امام صاحب نے ان کے ہاتھ پر توبہ کی اور خلوت گزیں ہو گئے۔ اللہ نے ان کا سینہ کھول دیا۔ اس خلوت سے نکلنے کے بعد امام صاحب نے تفسیر کبیر تصنیف فرمائی

[1] مفتاح السعادۃ جلد اول صفحہ ۴۵۰-۴۵۱ مطبوعہ دائرۃ المعارف۔

یقین کے اصطلاحی معنی۔ اس کے متعلق علماء کے اختلافات۔ اور اس کے حاصل کرنے کے طریقے آپ کے سامنے پیش ہو چکے اب مراتبِ یقین بھی سمجھ لیجیے:۔

مراتبِ یقین

یقین کے تین مراتب ہیں۔ علم الیقین[1] عین الیقین[2] حق الیقین[3]۔

ان مراتب کو یوں سمجھئے کہ ایک شخص نے دریا کو نہیں دیکھا۔ مگر اس کو دریا میں پانی ہونے کا یقین ہے اس مرتبے کو علم الیقین کہتے ہیں۔ یہی شخص جب دریا کے کنارے پر پہنچ جاتا اور اس کے پانی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے تو اس کو پانی کا عین الیقین ہو جاتا ہے اور یہی شخص جب اس دریا کا پانی پی لیتا یا اس کے اندر غوطہ لگاتا ہے تو اس کو پانی کا حق الیقین ہو جاتا ہے۔ بس یقین کے یہی تین مراتب ہیں جن کی صراحت علامہ راغب اصفہانی نے کی ہے جو اوپر گزر چکی ہے۔ ان تینوں میں پہلا کمتر دوسرا اس سے بالا اور تیسرا بالاتر مرتبہ ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ آیت زیرِ تفسیر میں اس کائنات ارضی کے کن امور کو نشانیوں سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ مگر اولاً آیت کے معنی کی

وضاحت بھی ضروری ہے۔

آیت کے معنی

قولہ تعالیٰ اِن فی ذٰلک لاٰیاتٍ للمومنینؔ فھی من الاٰیات المعقولۃ التی تتفاوۃ بھا المعرفۃ بحسب تفاوت منازل الناس فی العلم یعنی آیات سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو عقل سے سمجھ میں آتی ہیں جن کی معرفت لوگوں کے مراتب علمی کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے۔

آیات ارضی

زمین کی گولائی اور اس کا پھیلاؤ۔ یہ برّو بحر۔ یہ لق و دق بیابان یہ ناپیدا کنار سمندر یہ نہریں یہ دریا۔ یہ چھوٹے چھوٹے ٹیلے یہ سر بہ فلک پہاڑ۔ یہ نرم نرم گھاس یہ تناور درخت یہ خوش گوار میوے۔ یہ رنگ برنگ کے خوشبودار پھول۔ یہ ننھی ننھی چیونٹیاں۔ یہ گراں ڈیل ہاتھی۔ یہ خوشنما تتلیاں۔ یہ بلند پرواز پرند۔ الحاصل یہ ساری کائنات اور ان سب کی تخلیق کا نشاءۃ خلاصہ یعنی اشرف المخلوقات حضرت انسان بقول حافظ ابن کثیر" ایسی نشانیاں ہیں جو اپنے خالق کی عظمت اور اس کی قدرت باہرہ پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ نے قسم قسم کی نباتات پیدا کیں۔ اسی نے

زمین سے ٹیلے بلند کئے۔ اسی نے اس میں پہاڑ نصب کئے۔ اسی نے بے آب وگیاہ صحرا بنائے۔ اسی نے نہر وسمندر پیدا کئے۔ اسی نے لوگوں کے رنگوں اور زبانوں کو مختلف کیا۔ اسی نے ان کی جبلتیں علیحدہ علیحدہ بنائیں۔ اسی نے ان کے ارادوں اور قوتوں کو مختلف بنایا۔ اسی نے ان کی عقل وفہم اور حرکتوں میں تفاوت پیدا کیا۔ اسی نے کسی کو سعادت بخشی اور کسی کو شقی بنایا۔ علاوہ ازیں اگلی امتوں میں جن لوگوں نے خدا کے سچے رسولوں کو جھٹلایا اور آخر کار عذاب الٰہی میں مبتلا ہوئے ان کے آثار یہ سب دیدۂ عبرت نگاہ کے لئے خدا کی عظمت وجبروت کی نشانیاں ہیں"۔

علامہ نیشاپوری نے آیات ارضی کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک وہ جو زمین کے جرم میں پائی جاتی ہیں جیسے استدارۃ یعنی زمین کی گولائی اور اس کے طبقات کا ایک دوسرے سے مختلف ومتباین ہونا۔ دوسری وہ نشانیاں ہیں جو زمین کے اوپر پائی جاتی ہیں۔ جیسے پہاڑ وموالید ثلاثیہ یعنے جمادات ونباتات وحیوانات۔ تیسری وہ نشانیاں جو اوپر سے وارد ہوتی ہیں جیسے بارش وغیرہ۔ اور آیات ارضی کو

خصوصیت کے ساتھ اس لئے بیان فرمایا کہ یہ حواس سے قریب تر ہیں

مومنین کی خصوصیت کے متعلق لکھتے ہیں کہ

وخص کونھا آیات بالمومنین لانھم ھم المنتفعون بھا۔

یعنی "موقنین" سے مومنین مراد ہیں اور اس آیت میں ان کا ذکر خاص طور سے فرمانے کی وجہ یہ ہے کہ ان نشانیوں سے فائدہ اٹھانے والے یہی لوگ ہیں۔

الحاصل یہ کہ اس آیت مبارکہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے مومنین کو یہ ہدایت فرمائی ہے کہ وہ ان نشانیوں سے خواہ ارضی ہوں کہ نفسی معرفت الٰہی حاصل کریں۔

اب ان آیات پر ایک مومن اگر فلسفیانہ نقطہ نظر سے غور کرے یعنی دلیل و برہان سے کام لے کر ان نشانیوں سے معرفت الٰہی حاصل کرنی چاہے تو اس کی حرکت فکری اس طرح شروع ہوگی۔

معرفت فلاسفہ

(۱) بے شبہ یہ سب چیزیں موجود اور ممکن ہیں

(۲) اور ہر ممکن اپنے وجود میں غیر کا محتاج ہوتا ہے کیوں کہ ممکن کے دونوں جانب وجود و عدم ضروری نہیں ہوتے۔

اور چوں کہ ترجیح بلا مرجح محال ہے اس لئے اس کے جانب وجود کو ترجیح دینے کے لئے ایک ایسے مرجح کی ضرورت ہے جو خود ممکن نہ ہو۔ اس لئے کہ یہ ممکنات اگر ایک دوسرے کے علت و معلول ہوں تو دور لازم آئے گا اور دور محال ہے اور اگر ان ممکنات کی علت و معلول کا یہ سلسلہ لامتناہی چلا جائے تو تسلسل لازم آئیگا اور تسلسل بھی محال ہے لہذا معلوم ہوا کہ ان ممکنات کی جانب وجود کو ترجیح دینے والی ایک ایسی علت ہے جو خود اپنے وجود میں غیر کی محتاج نہیں۔ یعنی اس کا وجود ضروری (یعنی مستحیل الانفکاک) ہے اور عدم ممتنع ہے بس اسی کو واجب کہتے ہیں۔

اس سے واجب کا وجود تو ثابت ہو گیا مگر اس واجب کی توحید کو ثابت کرنے کے لئے حسب ذیل مقدمات کی بھی ضرورت ہے۔

(ا) واجب کا وجود اس کی نفس حقیقت ہے۔

(۲) واجب کا وجوب اور تعین اس کی نفس ذات ہے پھر ان کے بعد واجب کی توحید اس طرح ثابت ہو گی کہ اس کے وجوب وجود میں کوئی اس کا شریک و سہیم نہیں اور تعدد وجبا محال ہے لہذا برہان توحید کے انضمام کے بعد یہ ثابت ہوا کہ واجب ایک ایسا کلی ہے جو ایک ہی فرد میں منحصر ہے اور وہی خدا ہے۔ بس ساری کد و کاوش سے بس یہی معرفت حاصل ہوئی کہ واجب ایک ہی ہے۔

معرفتِ متکلمین

متکلمین نے اس سے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اس کائنات کو اس نقطۂ نظر سے دیکھا کہ اس کی ہر چیز میں تغیر ہے اور تغیر حدوث پر دلالت کرتا ہے جس کے معنی وجود بعد العدم کے ہیں یعنی یہ کائنات متغیر ہے اور ہر متغیر حادث ہے لہذا کائنات حادث ہے اور ہر حادث کے لئے محدث ہونا چاہیے چونکہ دور و تسلسل محال ہیں لہذا اس کا محدث قدیم ہے اور وہی خدا ہے۔

اس طریقۂ استدلال سے یہ معرفت حاصل ہوئی کہ وہ واجب بھی ہے اور قدیم بھی۔ یعنی دونوں کے طریقۂ برہان سے خدا کی یہ معرفت حاصل ہوئی کہ وجوب و قدم میں کوئی اس کا شریک نہیں بس وہی ایک ہستی واجب و قدیم ہے اور ساری کائنات ممکن و حادث ہے۔

مگر اللہ تبارک و تعالیٰ کی عظمت۔ اس کی قدرت۔ اس کی ربوبیت اور الوہیت اور حق سبحانہ تعالیٰ کے اسماء و صفاتِ برگزیدہ کے متعلق کم از کم ان براہین سے تو کوئی معرفت حاصل نہیں ہو سکی۔ اور یہ معرفت بھی محض انہیں لوگوں کو حاصل ہوئی

جنہوں نے منطق و فلسفہ و کلام کی طلب میں اساتذہ کرام کے آگے اپنے زانوئے ادب تہ کئے ہیں۔ مگر خیال رہے کہ ان کی یہ معرفت بھی ہر وقت معرض خطر میں ہے کیوں کہ نقض و ایراد کا دروازہ کھلا ہوا ہے یعنی اتنی کدوکاوش سے جو معرفت حاصل ہوئی اس کے بھی زایل ہو جانے کا ہر وقت کھٹکا لگا ہوا ہے۔

معرفتِ صوفیاءؒ ایک سالک تصفیہ قلب اور تزکیہ نفس کے بعد جب اس کائنات کو اس نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے کہ یہ سب اسماء و صفات الٰہی کے مظاہر ہیں تو اس کی نظر کے آگے تعینات کے پردے حائل نہیں ہوتے بلکہ نور ایمان کی شعاعیں ان کے پار ہو جاتی ہیں اور اس کائنات کی ہر ایک چیز میں اس کو اپنے مالک حقیقی کے کسی نہ کسی اسم یا صفت کی جھلک نظر آنے لگتی ہے۔

ان کے بھی مراتب مختلف ہیں۔ ان میں کوئی کہتا ہے: ما رایتُ شئیا الا رایتُ اللہ بعدہٗ۔ اور کوئی کہتا ہے: ما رایتُ شئیا الا رایتُ اللہ قبلہ۔ اور کوئی کہتا ہے: ما رایتُ شئیا الا رایتُ اللہ معہ۔ بہرحال ایک سالک کے آگے اس کائنات کی

ایک ایک چیز بلکہ ایک ایک ذرّہ اسماء و صفات الٰہی کی معرفت کا ایک ایسا دفتر بے پایاں ہے جس کے ایک نقطے کو بھی دنیا کی کوئی طاقت مٹا نہیں سکتی ۔

اُن عارفین کے بھی دو گروہ ہیں ۔ کسی پر اس معرفت کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ وہ اس بادۂ توحید سے بے خود و سرمست ہو جاتے ہیں بجز ذاتِ حق کے کسی اور کی طرف ان کی نظر نہیں جاتی ۔ یہ اسم کو مسمّٰی سے، صفت کو موصوف سے الگ کر کے نہیں دیکھتے، یہ ہمہ اوست کے قائل ہیں کیوں کہ ان کی نظر میں یہ ساری کائنات اور اس کی کثرت محض ایک آئینہ خانہ ہے جہاں وحدتِ مطلقہ ہی کا جلوہ دکھائی دیتا ہے ۔ چنانچہ ایک عارفِ کامل کا ارشاد ہے ؎

صفات و ذات چو از ہم جدا نمی بینم
بہر چہ می نگرم جز خدا نمی بینم

یہ حضرات وجودی کہلاتے ہیں اور وجودیہ کے علم بردار شیخ اکبر حضرت شیخ محی الدین ابن عربی رضؓ صاحبِ فتوحاتِ مکیہ ہیں ۔

دوسرا گروہ اُن عارفین کا ہے جو پاسِ ادب اور ظاہر شریعت کو

ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور اس بادۂ توحید سے بس اپنی سرخوشی ہی پر اکتفا کرتے اور ہمہ از وست کے قائل ہیں۔ یہ حضرات شہودی کہلاتے ہیں اور شہودیہ کے سپہ سالار حضرت شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ صاحب مکتوبات مجددیہ ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ان دونوں کے الفاظ وعبارات میں توفیق وتطبیق کی کوشش فرمائی ہے خدا ان کی سعی مشکور فرمائے اور ان کے مدارج اخروی میں ترقی دے۔ فقیر تو یہ عرض کرے گا: عباراتنا شتّٰی وحسنك واحدٌ۔ اور مولانائے رومؒ فرماتے ہیں: ؎

اے ترا با ہر دلے راز وگر ہر گدارا بر درت ناز دگر

در رباب عشق تارے بیش نیست ہست ہر جا نغمۂ ساز دگر

اللھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابه۔

وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ	اور خود تمہارے اندر بھی (خدا کی نشانیاں) ہیں کیا تم نہیں دیکھتے۔

حصول معرفت الٰہی کے دوسرے طریقے یعنی "سیر فی الآفاق" کے بعد "سیر فی الانفس" کا بیان ہے۔ اس کی تفسیر میں قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کی نظیر انسان میں موجود نہ ہو۔ جو اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ انسان اپنی مفید ہیئت۔ اپنے عجیب مناظر اور عجیب ترکیبوں اور نادر افعال پر قدرت رکھنے اور مختلف صنعتوں کے ایجاد و اختراع کے سبب گوناگوں حالات کا جامع اور اپنی آپ نظیر ہے۔ مگر علماء طریقت کے پاس "سیر فی الانفس" ایک دعوت فکر ہی نہیں بلکہ ایک حقیقت عیاں ہے اور اس کی تفصیل بیان سے باہر جس کے متعلق ایک دل دادہ حقیقت کا ارشاد ہے

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو سمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بہ چمن درآ

آپ جس خوش نصیب کے لئے یہ دروازہ کھل گیا اور اس نے اس چمن کی سیر کی وہاں اس نے کیا دیکھا اس کا اندازہ کرنے کے لئے حضرت شیخ اکبر کا خط پھر پڑھئے اور غور سے پڑھئے

اَللّٰهُمَّ نَوِّرْ قُلُوْبَنَا بِنُوْرِ مَعْرِفَتِكَ وَارْزُقْنَا اتِّبَاعَ
حَبِيْبِكَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ۔

وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ٥ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ 51-22
وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ٥ 51-23

اور آسمان میں تمہارا رزق ہے اور وہ (نعمتیں) جس کا تم سے وعدہ
کیا جاتا ہے ۔ پس قسم ہے آسمان و زمین کے پروردگار کی کہ بے شک یہ
(خبر) اس طرح سچ ہے جس طرح تم باتیں کرتے ہو۔

اس حیات دنیوی میں انسان کا اکثر وقت تلاش معاش اور پیٹ کے جھگڑے میں گذر جاتا ہے ۔ اور اکثر لوگ اس میں پھنس کر فکر عاقبت سے غافل ہو جاتے ہیں ۔ اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمہارا رزق آسمان میں ہے اس کا ایک صاف اور ظاہر مطلب تو یہ ہے کہ تمہارا رزق آسمان پر مقدر کر دیا گیا ہے اور اسی کے موافق تم کو ملتا رہے گا ۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان ترک تدبیر کر دے اور توکل کے بہانے پر نکما ہو کر بیٹھ جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ تلاش معاش کے لئے جائز اور مناسب تدبیر

کرے۔ مگر یہ خیال رکھے کہ تدبیر حصول رزق کا بظاہر سبب عادی ہے سبب حقیقی نہیں۔ بلکہ سبب حقیقی اُس رزاق حقیقی کا حکم ہے جس کو تقدیر کہتے ہیں اور وہی رزاق ورحیم تمہاری تدبیر میں اثر پیدا کرنے والا ہے۔ لہٰذا سبب کا مسبب وہی، اور اس کا حکم حقیقی سبب ہے۔ اگر انسان اس نکتہ کو پیش نظر رکھے تو کسی وقت بھی خدا کی یاد سے غافل نہ ہو بلکہ اس طرح اس کی فکر معاش بھی ایک عبادت بن جائے گی۔ کیوں کہ اس کی کوشش اگر کارگر ہوگی تو وہ خدا کا شکر کرے گا اور اگر تدبیر میں ناکامی ہوگی تو بھی وہ دل شکستہ اور پست ہمت نہ ہوگا بلکہ یہی خیال کرے گا کہ مشیت ایزدی یہی تھی۔ اس لئے یہ ناکامی ناکامی نہیں بلکہ اس کے اندر بھی اس حکیم مطلق کی کوئی حکمت مضمر ہے جس تک اس عاجز بندہ کی عقل کی رسائی نہیں۔

دوسرا خاص مطلب یہ ہے کہ جس رزق کو تم زمین سے حاصل کرتے ہو وہ دراصل آسمان سے نازل ہوتا ہے۔ یہاں آسمان سے مراد ابر اور رزق سے سبب رزق یعنی بارش مراد ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ "فِی السَّمَآءِ رِزْقُکُمْ" سے مراد بارش ہے۔

چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے :۔

اذا نزل السماء بارض قوم رعیناہ وان کانوا غضابا

وَمَا تُوعَدُونَ کی تفسیر میں عطاءؒ فرماتے ہیں کہ اس سے ثواب و عذاب مراد ہے۔ اور مجاہدؒ کہتے ہیں کہ اس سے خیر و شر مراد ہے اور ضحاک کا قول ہے کہ اس سے جنت و دوزخ مراد ہے۔ یہ اقوال اگرچہ بظاہر مختلف ہیں مگر حقیقتاً سب کا منشاء تقریباً ایک ہی ہے کیوں کہ جنت میں خیر کا بدلہ ثواب ہوگا اور دوزخ میں شر کی سزا میں عذاب دیا جائے گا۔

فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ اس کی تفسیر میں حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی ذات پاک کی قسم کھا کر فرماتا ہے کہ قیامت ۔ بعثت اور جزاء کا جو وعدہ اس مالک نے اپنے بندوں سے فرمایا ہے وہ حق ہے یعنی پورا ہو کر رہے گا اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجایش نہیں لہذا اس میں تمہیں کوئی شک بھی نہ کرنا چاہیئے ۔ یہ ایسا یقینی ہے جیسے تم آپس میں باتیں کرتے وقت

اپنی گفتگو کے متعلق کوئی شک وشبہ نہیں کرتے ۔ حضرت معاذؓ جب کسی چیز کے متعلق گفتگو فرماتے تو اپنے مخاطب سے یہ فرماتے کہ یہ بات ایسی ہی حق ہے یعنی حقیقت ہے جیسے اس وقت تمہارا یہاں موجود ہونا ایک حقیقت اور یقینی امر ہے ۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی بات کا یقین دلانا اور اس پر زور دینا ہو تو اہل زبان اس کو اس طرح بیان کرتے ہیں اور یہ عربی کا انداز بیان ہے جس کی تائید میں حافظ ابن کثیر نے حضرت معاذؓ کے طریق گفتگو کو پیش کیا ہے ۔

اوپر آیات ارضی اور آیات علوی پر توجہ دلانے کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی ذات کی قسم کھاتا ہے تاکہ تجدید وعدہ سے مومنین کے شوق میں تجدد اور منکرین کے مقابلے میں اتمام حجت ہو ۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ " قاتل اللّٰہ قوماً اقسم بھم ربھم ثم لم یصدقوا " ۔ خدا ان لوگوں کو ہلاک کرے جن کے لئے ان کے پروردگار نے قسم کھائی مگر اس پر بھی انہوں نے تصدیق نہ کی ۔

عـہ تفسیر حافظ ابن کثیر صفحہ (۲۱۱) ۔

عبادات اور معرفت کے بعد اخلاق کا بیان ہے یعنی حقوق اللہ
کے بعد حقوق العباد کو بیان فرماتا ہے اور اس کی ابتداء حضرت ابراہیم
علیہ السلام کی مہمان نوازی کے ذکر سے فرمائی ہے۔

51-24 هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ۘ اِذْ
51-25 51-26 دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ۚ
51-27 فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَاۗءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ۙ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ
قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۡ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۭ قَالُوْا
51-28 51-29 لَا تَخَفْ ۭ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۙ فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ
51-30 فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ۙ قَالُوْا
كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ۙ

کیا آپ کے پاس ابراہیم کے معزز مہمانوں کی خبر آئی جب وہ
(مہمان) ان (ابراہیم) کے پاس آئے تو کہا (تم پر) سلام ہو۔
(ابراہیم نے اس کے جواب میں ان سے) سلام کہا (اور خیال کیا کہ
یہ) اجنبی لوگ ہیں۔ پھر وہ چپکے سے اپنے اہل کی طرف گئے اور ایک فربہ[عہ]

عہ سورۃ ھود میں بعجل حنیذ ہے اور یہاں سمین ہے۔ یعنی وہاں بچھڑے کی حالت کا

بچھڑا (بھونا ہوا) لے کر آئے اور اس کو ان کے سامنے بڑھا دیا (مگر
مہمانوں نے اس کو ہاتھ نہ لگایا تو ابراہیم بلنے) کہا کیا تم نہیں کھاتے
پھر ان لوگوں سے (دل میں) خوف[1] محسوس کیا (تو) ان لوگوں (یعنی
مہمانوں نے ابراہیم سے) کہا کہ آپ خوف نہ کیجئے اور انہوں نے
آپ (ابراہیم) کو ایک دانشمند لڑکے کی بشارت دی۔ پھر تو ان
(ابراہیم) کی بی بی سارہ (خوشی سے) چلانے لگیں۔ اور (حیرت سے)
اپنے ماتھے پر ہاتھ[2] مار کر کہا کہ (کیا) بڑھیا بانجھ کو (لڑکا ہوگا تو) انہوں
(یعنی فرشتوں) نے کہا کہ تیرے پروردگار نے یہی فرمایا ہے بے شک
وہ بڑا حکمت والا اور بڑا دانا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور یہاں اس کی صفت کا بیان ہے۔ حنیذ کے معنی مشوی یعنی بھونے ہوئے کے ہیں وقیل ھو المشوی بحر الحجارۃ من غیر ان تمسہ النار (تفسیر قرطبی) جلد نہم صفحہ ۶۳ مطبوعہ مصر)

[1] الوجس الصوت الخفی ۔ قالوجس قالو ھو حالۃ تحصل من النفس بعد الھاجس لان الھاجس مبتدء التفکر ثم یکون الواجس الخاطر الخیفۃ الحالتہ التی علیھا الانسان من الخوف (مفردات راغب)

[2] فاقبلت امراۃ فی صرۃ فصکت وجھھا وقالت عجوز عقیم ۔ قال البیضاوی ای فلطمت باطراف الاصابع جبہتھا فعل المتعجب (محیط المحیط)

حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تبارک و تعالیٰ کے ان برگزیدہ بندوں میں ہیں جنہوں نے راہ خدا میں بڑی بڑی سختیاں جھیلیں اور ہر ابتلاء و امتحان میں ثابت قدم رہے۔ دہکتی آگ میں جھونکے گئے مگر اُف نہ کی اپنے مالک کی خوشنودی کے لئے لخت جگر کے گلے پر چھری پھیرنے کے لئے تیار ہوگئے اور تیوری پر بل نہ آیا۔ قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کا ذکر بار بار آتا ہے جس کے بظاہر دو سبب معلوم ہوتے ہیں:۔

(۱) آپ نے **دعوت** اور تبلیغ دین کے سلسلے میں کئی ہجرتیں کیں اور منکرین کی سرکشی سے جو رکاوٹیں آپ کو پیش آتی گئیں آپنے ان سب کا مقابلہ ہمت و استقلال سے کیا آخر کار منکرین کی بدانجامی اور حق کی فتح ہوئی۔ اس سے اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا مقصود ہے۔

(۲) دوسرا سبب یہ ہے کہ قرآن کے پہلے مخاطب بنی اسمٰعیلؑ یعنی عرب اور بنی اسرائیل یعنی یہود و نصاریٰ ہیں۔ لہٰذا حضرت ابراہیمؑ ان دونوں کے دادا ہوئے اس طرح عرب کے ساتھ یہود و نصاریٰ کو بھی بار بار یہ تنبیہ کی جا رہی ہے کہ گمراہی چھوڑ دو اپنے دادا یعنی ہمارے

مقبول بندے ابراہیمؑ کی پیروی کرو اور ہمارے محبوب بندے **محمد** (صلی اللہ علیہ وسلم) جو دین تمہارے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ کوئی نیا دین نہیں ہے بلکہ وہی ملت ابراہیمی ہے جس کو تمہارے آباء و اجداد نے بھلا دیا تھا اور نفس و شیطان کے پھندے میں پھنس کر اس راہِ حق سے بھٹک گئے تھے۔ اَب وہی دین آخری نبیؐ کے ذریعے آخری مرتبہ تمہارے سامنے پیش کیا جا رہا ہے اس کو قبول کر و گے تو نجات پاؤ گے ورنہ عاقبت برباد ہو جائے گی اور تمہارے دادا ابراہیمؑ کی تکذیب کرنے والوں کا جو انجام ہوا تمہارا بھی وہی حشر ہو گا۔

حضرت ابراہیمؑ کے معزز مہمان

حضرت ابراہیمؑ بڑے مہمان نواز تھے ایک روز ان کے سامنے تین خوب صورت نوجوان آئے اور آپ کو سلام کیا۔ ان نوجوانوں کے چہروں سے انتہائی حسن و جمال کے ساتھ غیر معمولی ہیبت و وقار کے آثار بھی ظاہر ہو رہے تھے کیوں کہ یہ دراصل خدا کے پاک فرشتے تھے مگر حضرت ابراہیمؑ نے ان کو نہیں پہچانا۔ آپ ان کو اپنے گھر لے گئے اور ان کی ضیافت کے لئے چپ کے سے اپنے گھر کے اندر گئے اور اپنے

مال میں سے ایک بہترین موٹا تازہ بچھڑا لے کر ذبح کیا اور اس کا بُھنا ہوا گوشت مہمانوں کے سامنے پیش کیا مگر ان مہمانوں نے اس کی طرف توجہ نہ کی تو حضرت ابراہیمؑ کو یہ اندیشہ ہوا کہ مبادا یہ کوئی بُرے ارادے سے آئے ہوں جو حسب دستور کھانے سے پرہیز کر رہے ہیں۔

حافظ ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ قد ذھب الامام احمد وطائفۃ من العلماء الی وجوب الضیافۃ للنزیل وقد وردت السنۃ بذٰلک۔ یعنی علماء کی ایک جماعت اور ہمارے امام سیدنا احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ نزیل یعنی مہمان کی ضیافت واجب ہے۔

شیخ اسمٰعیل حقی صاحب روح البیان لکھتے ہیں کہ فی الحدیث من آمن باللہ والیوم الآخر فلیکرم ضیفہ یعنی حدیث میں ہے کہ جو شخص خدا اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے اس کو اپنے مہمان کی عزت کرنی چاہئے۔ اکرام سے مراد خندہ روئی سے مہمان کا استقبال کرنا اور اس کی ضیافت میں جلدی کرنا اور اپنی ذات سے مہمان کی خدمت کرنی ہے۔ اس سے مراد کھانے کی کثرت نہیں بلکہ اپنی ذات سے

مہمان کی خدمت کرنا مہمان کی عزت ہے۔ کسی حکیم کا قول ہے کہ مہمان کی
اپنے باپ کی اور استاد کی خدمت کسی شخص کے لئے بھی عار نہیں خواہ وہ
سلطان ہی کیوں نہ ہو۔

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ اس آیت میں حسب ذیل آداب ضیافت
کو سلسلے وار بیان فرمایا گیا ہے:۔

(۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے مہمانوں کے سامنے بہت جلد
کھانا لے کر آگئے اور ان مہمانوں کو اس کی خبر بھی نہ ہوئی۔
(۲) آپ کو اپنے پاس جو سب سے بہتر چیز مل سکی وہ ان کے آگے
پیش کردی۔
(۳) آپ نے یہ نہیں کیا کہ کھانا ایک جگہ رکھ کر مہمانوں کو آگے
بڑھنے کے لئے کہا ہو بلکہ خود کھانا ان کے آگے بڑھا دیا تاکہ
ان کو زحمت نہ ہو۔

(۴) ان کو کھانے کا حکم نہیں دیا بلکہ نہایت شفقت و مہربانی
سے بطور درخواست ان سے پوچھا کہ کیا آپ لوگ کھانا تناول نہ فرمائیں گے؟
مگر ان مہمانوں نے اس کو ہاتھ نہ لگایا تو حضرت ابراہیمؑ کو ان کی طرف سے

دل میں خوف محسوس ہوا۔ اس پر انہوں نے آپ کو اطمینان دلایا کہ آپ خوف نہ کیجے اور ساتھ ہی آپ کو ایک بیٹے یعنی حضرت اسحاقؑ کی کی خوش خبری سنائی کہ یہ ہونے والا لڑکا بڑا ہو کر بڑا ہی دانش مند یعنی نبی ہوگا۔ اس سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کو حضرت بی بی ہاجرہؓ کے بطن سے ایک فرزند تھے جن کا نام حضرت اسمٰعیلؑ ہے مگر اس وقت تک آپ کی پہلی بی بی حضرت سارہؓ سے کوئی اولاد نہ تھی۔ خدا کے فرشتوں نے جب آپ کو یہ بشارت دی ہے اس وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر سو سال اور حضرت بی بی سارہؓ کی عمر نوے ۹۰ سال کی تھی[ع]۔ اس لئے ان کو یہ حیرت ہوئی کہ جوانی اور کہولت کے دونوں زمانے گذر گئے اور اولاد نہ ہوئی تو اب اس بڑھاپے میں کیسے اولاد ہوگی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کو خدا کی قدرت میں کوئی شک وشبہ تھا بلکہ ان کا یہ کہنا بہ لحاظ عادت تھا کیوں کہ عام طور پر انقطاع حیض کے بعد اولاد نہیں ہوتی اس لئے انہوں نے اپنے آپ کو عجوز عقیم کہا۔

اس وقت حضرت بی بی سارہؓ پر خدا کی بے پایاں رحمتوں کی بوچھار

ع قصص القرآن جلد اول صفحہ (۲۲۷)۔

ہو رہی تھی۔

(۱) فرشتے جن پر ان کا ایمان بالغیب تھا وہ اب ان کے سامنے اور ان کے مہمان تھے۔ جس سے ان کا ایمان یکایک علم الیقین سے عین الیقین کے مرتبے تک پہنچ گیا۔

(۲) اولاد کی دیرینہ آرزو پوری ہونے کی خوش خبری ملی وہ بھی خدا کی طرف سے اور اس کے فرشتوں کی زبانی۔

(۳) فرشتوں سے ہم کلامی اور مخاطبت کا شرف۔

(۴) خرق عادت کا ظہور یعنی ان کی خاطر عام قانون قدرت کی تبدیلی

یہ ساری باتیں اس بے پایاں رحمت پر دلالت کرتی ہیں جو اس وقت اس خاندان پر نازل ہو رہی تھی۔ الحاصل یہ کہ حیرت مسرت اور شکر گزاری کے ملے جلے جذبات نے حضرت بی بی سارہؓ کو بے خود کر دیا تھا اور اس عالم میں ان سے جو اضطراری حرکتیں صادر ہوئیں وہ اس مالک حقیقی کو اتنی پسند آئیں کہ اپنے حبیب پاک سے ان کا تذکرہ فرماتا ہے تاکہ قیامت تک یہ واقعات محفوظ رہیں۔ اور لوگ اس مقبول و برگزیدہ بندے کے دین ابراہیمی کی پیروی کی سعادت حاصل کریں

جس نے ان کا نام مسلمان رکھا۔

1-32 قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ[ل] أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ ۝ قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ 1-31

1-34 قَوْمٍ مُّجْرِمِينَ ۝ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّن طِينٍ ۝ مُّسَوَّمَةً 1-33

عِندَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِينَ ۝ فَأَخْرَجْنَا مَن كَانَ فِيهَا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ 1-35

1-37 فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ ۝ وَتَرَكْنَا 1-36

1-38 فِيهَا آيَةً لِّلَّذِينَ يَخَافُونَ الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ۝ وَفِي 1-39

1-39 مُوسَىٰ إِذْ أَرْسَلْنَاهُ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ ۝ فَتَوَلَّىٰ

1-40 بِرُكْنِهِ وَقَالَ سَاحِرٌ أَوْ مَجْنُونٌ ۝ فَأَخَذْنَاهُ وَجُنُودَهُ فَنَبَذْنَاهُمْ

فِي الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيمٌ ۝ وَفِي عَادٍ إِذْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ 1-41

الْعَقِيمَ ۝ مَا تَذَرُ مِن شَيْءٍ أَتَتْ عَلَيْهِ إِلَّا جَعَلَتْهُ 1-42

1-43 كَالرَّمِيمِ ۝ وَفِي ثَمُودَ إِذْ قِيلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوا حَتَّىٰ حِينٍ ۝

فَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّاعِقَةُ وَهُمْ -44

يَنظُرُونَ ۝ فَمَا اسْتَطَاعُوا مِن قِيَامٍ وَمَا كَانُوا مُنتَصِرِينَ ۝ -45

وَقَوْمَ نُوحٍ مِّن قَبْلُ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ ۝ ع -46

[ل] الخطب الامر العظيم يكثر فيه التخاطب (مفردات راغب)۔

51-4 وَالسَّمَاءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ۝ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا 51-4
51-4
51-4 فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ۝ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ
51-5 تَذَكَّرُوْنَ ۝ فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۚ
وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ؕ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ 51-5
كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا 51-5
سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۝ اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ۚ 51-5
51-5 فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ۝ وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى 51-5
51-5 تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝
مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ۝ 51-5
51-5 اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ۝ فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا 51-5
51-6 ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُوْنِ ۝ فَوَيْلٌ
لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ يَّوْمِهِمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ۚ

(ابراہیمؑ نے ان فرشتوں سے) کہا کہ تمہیں کونسی مہم درپیش ہے
اے (خدا کے) بھیجے ہوئے (فرشتو) ۔ ان (فرشتوں نے) کہا کہ ہم ایک
گناہ گار قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں تاکہ ہم ان پر گارے کے (ایسے)

پتھر برسائیں جو حد سے گزر جانے والوں کے لئے آپ کے پروردگار کے
پاس سے نشان کردئے گئے ہیں۔ مگر اس میں جو ایمان دار ہیں ہم نے
ان کو (اس عذاب سے) خارج کردیا مگر اس (بستی) میں ہیں مسلمانوں کا
صرف ایک گھر ملا اور دردناک عذاب سے ڈرنے والوں کے لئے وہاں
ہم نے ایک نشانی چھوڑی ہے۔

اور موسیٰ (کے قصے) میں بھی (ایک نشانی) ہے جب ہم نے اس
(موسیٰؑ) کو ایک کھلی ہوئی دلیل کے ساتھ فرعون کے طرف بھیجا تو اس نے
اپنی قوت (یعنی اراکین سلطنت) کے ساتھ روگردانی کی۔ اور (موسیٰ
کے متعلق) کہا کہ (یہ) جادوگر یا دیوانہ ہے لہٰذا ہم نے اس کو اور اس کے
لشکر کو پکڑ لیا اور ہم نے ان کو دریا میں پھینک دیا۔ اور وہ (فرعون)
سزاوار ملامت تھا۔ اور قصۂ عاد میں (بھی ایک نشانی) ہے جب
ہم نے ان کی طرف ایک مضر ہوا بھیجی کہ وہ جس چیز کو لگی اس کو بوسیدہ
(ہڈی کا) سا بنائے بغیر نہ چھوڑا۔ اور ثمود (کے قصے) میں بھی (ایک
نشانی) ہے کہ ان سے کہا گیا کہ ایک مدت تک فائدہ اٹھاؤ۔ مگر انہوں نے
اپنے پروردگار کے حکم سے سرتابی کی تو ان کو کڑاکے نے آ لیا اور وہ

دیکھ رہے تھے مگر وہ کھڑے نہ ہو سکے اور نہ وہ بدلہ لے سکے۔ اور ان سے پہلے ہم نے
نوحؑ کی قوم کو (ہلاک کیا) بے شک وہ لوگ بدکار تھے۔
ہم نے اپنی قدرت سے آسمان کو بنایا اور بے شک ہم بڑی قدرت
والے ہیں۔ اور زمین کو ہم نے بچھا دیا اور ہم سب سے اچھا بچھانے والے
ہیں۔ اور ہم نے ہر چیز کا جوڑا پیدا کیا تاکہ تم غور کرو (اے پیغمبر آپ ان سے
کہیئے کہ) اللہ کی طرف بھاگو۔ بے شک میں خدا کی طرف سے کھلا ہوا
ڈرانے والا ہوں اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو معبود نہ بناؤ بے شبہ
میں اس کی طرف سے کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ اسی طرح ان سے
پہلے بھی کوئی رسول نہیں آیا مگر انہوں نے اس کو یہی کہا کہ وہ جادوگر
یا دیوانہ ہے (کیا یہ) لوگ ایک دوسرے کو اس کی وصیت کرتے آرہے
ہیں۔ بلکہ یہ ایک سرکش قوم ہے۔ بس (اب) آپ ان لوگوں سے
منہ پھیر لیجے آپ پر (عدم تبلیغ کا) الزام نہیں (لگ سکتا) اور (مسلمانوں
کو) نصیحت کیجے کیوں کہ نصیحت مومنین کو نفع دیتی ہے۔ اور نہیں پیدا
کیا میں نے جن و انس کو مگر اس لئے کہ وہ (اللہ کی) عبادت کریں۔
میں ان سے نہ تو رزق کا طالب ہوں اور نہ میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے

کھانا کھلائیں۔ بے شک اللہ ہی رزق دینے والا (اور) زبردست
قوت والا ہے۔ پس بے شک جن لوگوں نے ظلم کیا ان کو بھی وہی نصیب
ہوگا جیسا ان کے (گزرے ہوئے) دوستوں کو نصیب ہوا تھا مگر وہ مجھ سے
(اس کی) جلدی نہ کریں۔ پس انکار کرنے والوں کے لئے افسوس ہے
اوس دن جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام خدائے تعالیٰ کے جلیل القدر نبی تھے اور انبیاء علیہم السلام کے خواب جس طرح ایک حقیقت ہوتے ہیں اسی طرح ان کے خطرات بھی اپنے اندر ایک صداقت رکھتے ہیں اس لئے آپ کو پھر بھی ایک تشویش باقی تھی کہ یہ فرشتے اگرچہ یہاں تو کسی برے ارادے سے نہیں آئے مگر کوئی دوسرا خاص اور بڑا کام ضرور ان کے پیش نظر ہے۔ اس لئے آپ نے ان سے دریافت فرمایا کہ آپ کو کونسی مہم درپیش ہے۔ آخر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اندیشہ درست ثابت ہوا اور جواب ملاکہ

اِنَّآ اُرۡسِلۡنَآ اِلٰی قَوۡمٍ مُّجۡرِمِیۡنَ ۙ	یعنی ہم مجرمین کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ مجرمین سے

یہاں اہل سدوم حضرت لوط علیہ السلام کی امت مراد ہے جو کفر و بے دینی اور اپنے نبی کی تکذیب و انکار کے ساتھ ساتھ بد اخلاقی میں حیوانات سے بھی بدتر ہو گئی تھی۔ اور ایسی بدکاری کی موجد تھی جس کا نتیجہ پوری نوع انسانی کی تباہی ہو سکتا تھا۔ غرض معاشرہ انسانی کے لئے یہ قوم ایک عضوِ فاسد کا حکم رکھتی تھی جس کو یک لخت قطع کر دینے کی ضرورت تھی تاکہ یہ مرض پھیل کر تمام معاشرے کے جسم کو برباد نہ کر دے۔ حضرت ابراہیمؑ صاحب شریعت رسول تھے اور حضرت لوطؑ ان کے بھتیجے ان کی شریعت کے پیرو اور منصب نبوت سے سرفراز تھے۔ آپ کو حضرت ابراہیمؑ نے خدا کے حکم سے اہل سدوم کی ہدایت کے لئے بھیجا تھا۔ وہاں آپ کی دعوت و تبلیغ پر کسی نے توجہ نہ کی بلکہ آپ کا مذاق اڑایا اور اپنی بے حیائیوں اور خباثتوں سے باز نہ آئے حضرت لوطؑ کو یہ جواب دیا کہ " اَخۡرِجُوۡهُمۡ مِّنۡ قَرۡيَتِكُمۡ ۚ اِنَّهُمۡ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوۡنَ " یعنی لوط اور ان کے خاندان کو اپنی بستی سے باہر نکال دو بے شک یہ لوگ پاک باز بنتے ہیں۔ اس پر بھی حضرت لوطؑ ان کو برابر سمجھاتے اور ہدایت کرتے رہے مگر اہل سدوم کو اپنی خباثت اور

بے حیائی پر ناز تھا۔ قبولِ حق کی صلاحیت ان سے معدوم ہو گئی تھی لہٰذا جب ان سے کوئی جواب نہ بن آیا تو انہوں نے حضرت لوطؑ کو دعوت مقابلہ دی کہ "اِئۡتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ" یعنی اگر تم سچے ہو تو ہم پر خدا کا عذاب لاؤ۔ بس اس دعوت مقابلہ کے جواب میں ان کا منہ مانگا عذاب لے کر یہ فرشتے اس قوم کو برباد کرنے جا رہے تھے۔

خطیب شربینی نے یہاں ایک نازک سوال اٹھایا ہے اور اس کا ایک بہترین جواب بھی دیا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ جو فرشتے امت لوطؑ پر عذاب لے جا رہے تھے تو ان کا حضرت ابراہیمؑ کے پاس ٹھیرنا اور آپ کو اولاد کی خوش خبری سنانا اس وقت کے لحاظ سے کیا معنی رکھتا ہے اس کے جواب میں خطیب موصوف لکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ چونکہ شیخ الانبیاء ہیں اور خود حضرت لوطؑ بھی چوں کہ آپ کے پیرو اور آپ ہی کے دین کی طرف اہل سدوم کو دعوت دے رہے تھے اس لئے صاحب شریعت یعنی حضرت ابراہیمؑ کو بھی اس سے مطلع کر دینا ضروری تھا۔ کیوں کہ اصل صاحب شریعت تو حضرت ابراہیمؑ تھے اس لئے پہلے

آپ کو مطلع فرما دیا گیا کہ لوطؑ کی امت نے ہماری اس شریعت کا انکار کیا جو ہم نے تم پر نازل کی تھی اور جس کی تبلیغ و دعوت لوطؑ کے ذریعہ اہل سدوم کو دی گئی تھی لہٰذا ان سرکشوں کے مطالبہ پر ہمارا عذاب نازل کیا جارہا ہے۔ اور اس کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسحٰقؑ کی بشارت دینے میں یہ مصلحت تھی کہ اس عذاب میں جس قدر لوگ ہلاک ہوں گے ان سے بہت زیادہ لوگ خود تمہاری اس نسل سے خدا پیدا کردے گا۔ لہٰذا اسی کا نتیجہ ہے کہ نسل بنی اسرائیل کی دنیا میں کثرت ہوئی۔ اسرائیل حضرت یعقوبؑ کا نام ہے اور وہ حضرت اسحٰقؑ کے فرزند ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اہل سدوم پر اُن کا منہ مانگا عذاب نازل ہوا جس کی چار صورتیں قرآن حکیم کے مختلف سورتوں میں بیان ہوئی ہیں:—

(۱) ان کی آنکھیں چوپٹ کردی گئیں۔

(۲) صاعقہ یعنی ایک ہولناک آواز نے ان کو آلیا۔

(۳) ان پر گارے کے پتھر برسائے گئے۔

(۴) وہ خطۂ زمین الٹ دیا گیا۔

جس وقت یہ عذاب نازل ہوا ہے اس وقت ساری بستی میں صرف ایک ہی گھر مسلمانوں کا تھا۔ اور وہ حضرت لوطؑ کا گھر ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے بچالیا اور وہ اس بستی سے باہر چلے گئے۔ خود حضرت لوطؑ کی بی بی بھی دولت ایمان سے بے بہرہ تھیں اس لئے وہ بھی اس عذاب میں مبتلا ہوئیں۔ اس قوم کی تباہی و بربادی بھی ان لوگوں کے لئے ایک نشانی ہے جو خدا کے دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں۔

دوسری نشانی حضرت موسیٰؑ کا واقعہ ہے۔ آپ کھلے اور روشن دلائل کے ساتھ فرعون کی طرف بھیجے گئے مگر وہ اپنی حکومت کے نشہ میں چور تھا اور شان و شوکت کے گھمنڈ میں آپے سے باہر تھا۔

فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ ابن جریر اور ابن منذر نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ رکنہٖ سے بقومہٖ مراد ہے اور مجاہدؒ کہتے ہیں کہ برکنہ سے بعضدہٖ و اصحابہٖ مراد ہے یعنی اس نے اپنے ارکین سلطنت کے ساتھ خدا کے فرستادہ پیام سے منہ پھیر لیا۔ فرعون نے پہلے تو حضرت موسیٰؑ سے

لہ تفسیر درمنثور جلد ششم صفحہ ۱۱۵ -

معجزات طلب کئے مگر جب معجزات دیکھ چکا تو حق کو قبول کرنے کی بجائے
نہایت دریدہ دہنی اور گستاخی سے پیش آیا۔ اور حضرت موسیٰؑ کی نسبت
یہ کہا کہ (معاذ اللہ) یہ جادوگر یا دیوانہ ہے مگر اس سے خدایا موسیٰ
علیہ السلام کا کچھ نہ بگڑا بلکہ آخر کار وہ سرکش اپنے خدم وحشم کے ساتھ
خدائے تعالیٰ کے حکم سے دریا میں غرق کر دیا گیا اور ساری شیخی کرکری
ہو گئی۔

تیسری نشانی۔ قوم عاد کی تباہی کو بیان فرمایا گیا ہے کہ انہوں نے
اپنے پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام کی تکذیب کی اور حق کو قبول نہ کیا۔
اور آپ کو (معاذ اللہ) بے وقوف کہا۔ مگر حضرت ہودؑ اس پر بھی اپنی
دعوت وتبلیغ سے باز نہ آئے اور ان کو برابر ہدایت کرتے رہے
اور خدا کے عذاب سے ڈراتے رہے آخر ان لوگوں نے آپ سے مطالبہ
کیا کہ "فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ" یعنی اگر تم
سچے ہو تو جس عذاب کا وعدہ کرتے ہو وہ ہمارے پاس لاؤ۔ حضرت
ہودؑ نے اس پر بھی ہمت نہ ہاری اور ان کو سمجھایا مگر اس بدنصیب
قوم پر کوئی اثر نہ ہوا آخر ان کا یہی منہ مانگا ہولناک عذاب ان پر

مسلط ہو گیا۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ آٹھ دن اور سات راتیں مسلسل سخت ہوا کے طوفان آتے رہے اور ان کی ساری آبادی کو تہ و بالا کر ڈالا۔ ان میں کے بڑے بڑے طاقت ور اور گراں ڈیل جوان جو اپنی طاقت و قوت کے بل بوتے پر کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے اس ہوا نے ان کو ایک تنکے کی طرح اٹھا کر پھینک دیا۔ اور وہ مر کر فنا ہو گئے۔ یہ ہوا ایسی تباہ کن تھی کہ جس چیز کو لگتی اس کو پارہ پارہ اور ریزہ ریزہ کر دیتی اور یہ معلوم ہوتا کہ وہ چیز گویا ایک بوسیدہ ہڈی ہے۔ غرض ان سرکشوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا تاکہ ان کی تباہی آنے والی نسلوں کے لئے عبرت کی نشانی بنے

چوتھی نشانی۔ قوم ثمود کی تباہی ہے کہ انہوں نے اپنے پیغمبر حضرت صالحؑ کی تکذیب کی۔ پہلے ان سے معجزہ طلب کیا اور جب ان کی شرائط کے بموجب اونٹنی ظاہر ہوئی تب بھی وہ ایمان نہ لائے اور اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ ایک دن موقع پا کر خدا کی اونٹنی کو ہلاک کر ڈالا۔ حضرت صالحؑ بہت دل گیر ہوئے اور فرما دیا کہ اے بدبخت قوم اب عذاب الٰہی کا انتظار کر۔ تین روز کے بعد خدا کا عذاب نازل ہو گا اور تم سب کو ہمیشہ کے لئے برباد کر دے گا۔ بیہقیؒ اپنی سنن میں قتادہؓ سے روایت

کرتے ہیں کہ "اِذْ قِیْلَ لَھُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰی حِیْنٍ" سے مراد یہ ہے کہ پہلے ان کو بتا دیا گیا تھا کہ اور تین دن تک انہیں اس دنیا میں رہنا ہے۔ ان موعودہ تین دنوں میں ان کے چہروں کے رنگ بدلتے گئے۔ پہلے روز زرد دوسرے دن سرخ اور تیسرے دن ان سب کے چہرے سیاہ ہو گئے۔ بہرحال تین دن اس ہیبت و پریشانی میں گزرے۔ اور اس کے بعد وقت موعود آپہنچا اور ان کو صاعقہ نے لے لیا۔ صاعقہ کے متعلق راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ الصاعقۃ الصوت الشدید من الجوّ ثم یکون منہ نارًا فقط او عذاب او موت وھی فی ذاتھا شیٔ واحد وھذہ الاشیاء تاثیرات منھا۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ ثمود پر عذاب الٰہی ایک ہیبت ناک آواز کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اور ان میں کا ہر شخص جہاں تھا وہیں ہلاک ہو گیا۔ یعنی اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکا۔ وہ اپنی تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے مگر ان میں اپنی جگہ سے اٹھنے کی سکت بھی نہ تھی۔

وَّمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ۙ	اس کا مطلب فقیر کے خیال ناقص میں یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی امتوں پر

ماں باپ سے زیادہ شفیق ہوتے ہیں مگر منکرین اپنی جہالت وحماقت یا ضد و عناد سے ان کو اپنا دشمن سمجھتے اور ان سے بغض و عداوت رکھتے ہیں اسی طرح قوم ثمود بھی اپنے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام کو اپنا دشمن اور حریف خیال کرتی تھی۔ اور اسی مخالفت و عداوت نے ان کو اس حد تک پہنچادیا تھا کہ انہوں نے حضرت کو دعوت مقابلہ (چیلنج) دے دی کہ ہم پر عذاب لاؤ۔ مگر جب عذاب الٰہی نازل ہوا تو ساری قوم دیکھتے دیکھتے نہایت بے بسی سے ہلاک و برباد ہوگئی اور اپنے مزعومہ دشمن یعنی حضرت صالح علیہ السلام سے نہ بدلہ لے سکی اور نہ ان کا کچھ بگاڑ سکی۔

یہی حالت بعینہٖ منکرین قریش اور کفار مکہ کی تھی کہ وہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیشہ مخالفت کرتے رہے۔ آپ کے درپئے آزار اور جان کی گھات میں تھے۔ ثمود کی تباہی میں ان کے لئے یہ درس عبرت ہے کہ جب ناقۃ اللہ کو ہلاک کردینے کا انجام ایک قوم کی تباہی و بربادی ہوا تو حبیب اللہ کی جان کو نقصان پہنچانے کا انجام کتنا خطرناک ہوگا اس کا اندازہ بھی عقل انسانی کی دسترس سے باہر ہے۔

واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

پانچویں نشانی حضرت نوحؑ کی قوم کا انجام ہے کہ انہوں نے حضرت نوحؑ کی دعوت قبول نہ کی اور اپنی بداعمالیوں سے باز نہ آئے نتیجہ یہ ہوا کہ خدائے تعالیٰ نے ایک سیلاب سے انہیں تباہ کر ڈالا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ پانچ نشانیاں اگلی امتوں کی بیان فرمائی ہیں تاکہ اُس کے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے منکرین ان واقعات سے درس عبرت حاصل کریں کہ اگلی امتوں میں جن لوگوں نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کی اور حق کو قبول نہ کیا اپنے کفر و بداعمالیوں سے باز نہ آئے۔ خدا اور اُس کے پیغمبروں سے مخالفت وگستاخیاں کیں ان سب کا انجام تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہ ہوا۔ اُن کی جسمانی طاقت۔ اُن کی دولت۔ اُن کی شوکت وسلطنت وغیرہ یہ سب چیزیں ان کے کچھ کام نہ آئیں۔ وہ تباہ ہوئے اور ان کی تباہیاں آنے والی نسلوں کے لئے عبرت کی نشانیاں ہیں۔ مگر ان نشانیوں سے قسی القلب جن کا ضمیر فنا ہو گیا ہے وہ کوئی

فائدہ نہیں اٹھاتے ۔ بلکہ ان سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جن کے دلوں کے کسی نہ کسی گوشے میں کچھ نہ کچھ خوف خدا جاگزیں ہے ۔

منکرین کی بھی ذہنیتیں مختلف ہوتی ہیں کوئی محض ضد و عناد یا خباثتِ نفس سے حق کا انکار کرتا ہے اور کوئی قبولِ حق میں اس لئے پس و پیش کرتا ہے کہ ابھی امرِ حق اس کے سمجھ میں نہیں آیا ۔ اس لئے قرآن حکیم نے بھی بیان کے دو طریقے اختیار کئے ہیں ۔ جو لوگ بد باطنی یا خباثت سے انکار کرتے ہیں ان کو اگلی امتوں کے منکرین اور ان کا انجام بتایا ہے کہ وہ خدا کے خوف سے راہ راست پر آجائیں ۔ اور جو بد باطن تو نہیں مگر امرِ حق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پس و پیش و تردد کی حالت میں ہیں ان کے لئے اپنی قدرت و عظمت کی نشانیاں بیان فرماتا ہے ۔ چنانچہ پہلی قسم کے منکرین کے لئے مذکورہ پانچ نشانیاں انذاراً بیان فرمایا جن سے اس کی ہیبت و سطوت ظاہر ہوتی ہے اب ایسی تین نشانیاں بیان فرماتا ہے جو اہل فکر و نظر کو دعوت فکر دیتی ہیں تاکہ جن لوگوں نے ابھی حق کو نہ سمجھا ہو وہ ان پر غور کریں کیوں کہ ان سے ان کے خالق کی قدرت و عظمت ظاہر ہوتی ہے ۔

وَالسَّمَآءَ بَنَیْنٰھَا بِاَیْدٍ۔الآیۃ ہم نے آسمان[1] کو اپنی قدرت سے پیدا کیا زمین[2] کو پھیلا کر بچھایا۔ اور ہر چیز[3] کے جوڑے پیدا کئے۔ زمین و آسمان سے کائنات علوی و سفلی مراد ہے جس طرح کہ اوپر بیان ہو چکا۔

وَمِنْ کُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ کی تفسیر میں ابن جریر وابن منذر مجاہدؒ سے نقل کرتے ہیں کہ اس سے مراد کفر و ایمان۔ شقاوت و سعادت ہدایت و گمراہی۔ رات دن۔ جن و انس۔ بر و بحر۔ شمس و قمر صبح و شام اور اسی قسم کے جوڑے ہیں۔ یعنی اس آیت کے مفہوم میں نر و مادہ کے علاوہ اضداد بھی داخل ہیں۔

لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ تاکہ تم ان پر غور کرو۔ یعنی ان پر غور کرو تو معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز کے لئے کوئی نہ کوئی ضد اور مقابل موجود ہے اور بقول خرازؔ "فردانیت" صرف اسی ایک ذات کے لئے مخصوص ہے جو اس کا خالق اور رب ہے۔

فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ اب اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے حبیبؐ پاک سے ارشاد فرماتا ہے کہ آپ اُن سے کہہ دیجے کہ وہ اللہ کی طرف بھاگیں۔ یعنی جن لوگوں نے ہمارے کلام کو سمع قبول سے سنا اور ان آیات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا اپنے ضد و عناد سے باز آ گئے یا جن کا شک و تردد رفع ہو گیا آپ ان سے کہیے کہ وہ کفر سے ایمان کی طرف۔ معصیت سے اطاعت کی طرف باطل سے حق کی طرف۔ ظلمت سے نور کی طرف۔ جہل سے علم کی طرف۔ شک و تردد سے یقین کی طرف بھاگیں۔ اور یہ حکم آپ ان کو اس حیثیت سے دیں کہ آپ ہماری طرف سے کھلے ہوئے ڈرانے والے ہیں۔ اور آپ ان سے یہ فرما دیجے کہ اس کے بعد وہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں اور ان سے یہ کہہ دیجے کہ میں خدا کی طرف سے کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں جس کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس امر و نہی کا مجاز گردانا ہے۔ اس کے بعد اپنے حبیبؐ پاک کو تسلی دیتا ہے کہ جن لوگوں میں قبول حق کی صلاحیت نہیں ہے وہ آپ کی شان میں گستاخی کرتے ہیں۔ آپ ان کی باتوں سے ملول و دل گیر نہ ہوں

ان سے پہلے کے منکرین کی بھی یہی حالت تھی کہ ہماری طرف سے جو رسول ان کے پاس بھیجا جاتا تو وہ اس کو جادوگر یا دیوانہ کہتے آپ کے ساتھ بھی ان کا وہی عمل ہے جو اگلی امتوں کے سرکشوں کا اپنے پیغمبروں کے ساتھ رہا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ ایک دوسرے کو اس کی وصیت کرتے آرہے ہیں۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ منکرین انتہائی سرکش ہیں۔ اگر یہ اپنی سرکشی سے باز نہیں آتے اور ایمان

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ۝

نہیں لاتے تو اس کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے کیوں کہ آپ نے دعوت و تبلیغ کا حق ادا کر دیا اور خدا کی حجت تمام ہو گئی۔ لہٰذا آپ ان سے منہ پھیر لیجے اب ان سے خطاب کرنے اور ان کو پیغامِ حق سنانے کی ضرورت نہیں۔

تفسیر درمنثور میں حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے دو روایتیں منقول ہیں جن کا ماحصل یہ ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے سے صحابہ کرامؓ سخت پریشان ہوئے اور ان کو خیال ہوا کہ اب عذابِ الٰہی نازل ہوا چاہتا ہے کیوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو منہ پھیر لینے کا

حکم دیا گیا ہے مگر جب یہ آیت نازل ہوئی کہ

وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ

تو صحابہؓ کو اطمینان ہوا۔ اور ذکّر سے مراد یہاں یہ ہے کہ قرآن حکیم کے ذریعے نصیحت کیجے۔ ابن منذر نے سلمان بن حبیب المحاربی سے یہ روایت نقل کی ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ جس شخص کے دل میں نصیحت کا اثر محسوس ہو تو اس کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ مومن ہے[1]۔ نفس انسانی میں دو قسم کی قوتیں ہیں نظری و عملی[2]۔ قوت نظری کی تکمیل ایمان و عرفان سے ہوتی ہے اور قوت عملی کی تکمیل عبادت و اطاعت سے۔ اور انہیں دونوں قوتوں کی تکمیل کے لئے انبیا علیہم السلام بھیجے جاتے ہیں لہٰذا قوت نظری کی تکمیل کے بعد اب قوت عملی کی تکمیل کا بیان ہے۔ مگر خیال رہے کہ عمل فرع ہے اور ایمان اصل یعنی بغیر ایمان کے کوئی عمل نجات نہیں دلا سکتا۔

لہ تفسیر در منثور جلد ششم صفحہ ۱۱۶

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ	یعنی جن و انس کو پیدا کرنے سے

خدا کی کوئی غرض نہیں کہ جس سے اس کی تکمیل ہو بلکہ ان کی غایتِ آفرینش یہ ہے کہ یہ دونوں خدا کی عبادت کریں تاکہ ان کا ایسا تزکیۂ نفس ہو جو نجات و عرفان کے لئے ضروری ہے اور اس سے ان کی روحانیت ترقی کرے ورنہ خدا ان کی عبادت کا محتاج نہیں۔ لہٰذا یہاں غایت بمعنی "حکمت" ہے کیوں کہ یہی فعل جب خدا کی طرف منسوب ہو تو حکمت ہے اور مخلوق کے لحاظ سے غایت اور مقصودِ حیات ہے جیسے اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے کہ "وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا" اس امر سے امر تکلیفی مراد ہے نہ کہ امر تکوینی۔

اور مجاہد یہ فرماتے ہیں اور بغوی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے کہ "یَعْبُدُوْنَ" سے "یَعْرِفُوْنَ" مراد ہے اور اس توجیہ کا مدار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "کُنْتُ کَنْزًا مَّخْفِیًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ لِاُعْرَفَ" مگر معرفت سے مراد وہ معرفت ہے جو عبادت سے

حاصل ہوتی ہے نہ کہ وہ معرفت جو فلاسفہ کو حاصل ہوتی ہے۔

صاحب روح البیان لکھتے ہیں کہ عبادت کی دس قسمیں ہیں،
نماز[1] ۔ زکوٰۃ[2] ۔ روزہ[3] ۔ حج[4] ۔ تلاوت قرآن[5] ۔ ہر حال میں خدا[6] کا ذکر کرنا ۔ طلب حلال[7] ۔ مسلمانوں[8] کے حقوق اور حقوق صحبت کا ادا کرنا ۔ امر بالمعروف[9] و نہی عن المنکر یعنی نیکی کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا ۔ اور سنت[10] کی اتباع کرنا ۔ اور یہ سعادت کی کنجی اور اللہ کی محبت کی نشانی ہے جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:
"قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ" عہ

اس کے بعد حق سبحانہ تعالیٰ اپنی بے نیازی کو بیان فرماتا ہے کہ وہ اپنے بندوں سے مستغنی ہے۔

مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنَ

میں اپنے بندوں سے رزق کا طالب نہیں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھانا کھلائیں۔

خطیب شربینی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس میں یہ تعریض ہے کہ

عہ تفسیر روح البیان جلد نہم صفحہ (۱۷۹) ۔

کافر جس طرح اپنے اصنام کے آگے کھانا بطور بھوگ چڑھاتے ہیں
اللہ ایسے بھوگ کا طالب نہیں بلکہ

هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ | بے شبہ اللہ ہی ان کو رزق دینے والا اور

قوت والا ہے۔ اب منکرین اپنی اس حماقت پر غور کریں کہ حقیقتاً لائق عبادت کون ہے وہ بے حس وحرکت معبود جن پر خدا کا دیا ہوا رزق چڑھایا جارہا ہے اور وہ رزق سے فائدہ اٹھانا تو کجا اس پر جو مکھیاں بھنکتی ہیں ان کو اڑا بھی نہیں سکتے یا وہ خدا جس نے ساری کائنات کو پیدا کیا اور ان سب کو رزق دیتا ہے۔ فَاعْتَبِرُوْا يَا اُولِی الْاَلْبَابِ۔ اس کے بعد منکرین کے انجام کے متعلق فرماتا ہے کہ

فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا الآیہ | یعنی جن لوگوں نے رسول اکرم کی تکذیب کی ان کا حشر بھی

اگلے ظالموں کا سا ہوگا۔ ذَنُوْب اصل میں پانی سے بھرے ہوئے بڑے ڈول کو کہتے ہیں لیکن یہ مجازاً نصیب (حصے) کے معنی میں

مستعمل ہے اور گذشتہ امتوں کے ظالموں کو ان ظالموں کے اصحاب فرماتا ہے اور اصحاب جمع ہے صاحب بمعنی ساتھی کی جس کے لئے صحبت ضروری ہے لہذا یہاں ان کی صحبت ماضیہ مراد نہیں بلکہ صحبت آتیہ مراد ہے یعنی یہ منکرین بھی دوزخ میں اگلی امتوں کے منکروں کے ساتھ رہیں گے۔ حاصل یہ کہ قیامت میں جو سزا ان ظالموں کو ملنے والی ہے وہی ان کے لئے بھی یقینی ہے مگر وہ اس سزا کے لئے جلدی نہ کریں۔ کیوں کہ ہم نے اپنے حبیب پاک محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو سارے عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ اس لئے دوسرے انبیاء علیہم السلام کی امتوں پر ان کی موجودگی میں اسی دنیا میں جس طرح عذاب نازل کیا گیا تھا ویسا عذاب ان پر نازل نہیں کیا جائے گا بلکہ ان کا عذاب قیامت پر موقوف ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا الآية پھٹکار ہے ان لوگوں پر جو اپنے موعودہ دن یعنی قیامت کا انکار کرتے ہیں کیوں کہ ان کے انکار سے یہ دن ٹل نہیں سکتا اور نہ وہ عذاب دوزخ سے بچ سکتے ہیں۔ (الحمد للہ کہ تفسیر سورہ ذٰریٰت ختم ہوئی)